قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ —— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ —— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون : ۸۷۶۲۱۹

انتظامیہ

چیئرمین بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خاں

ناظم۔ محمد لطیف چوہدری

معاون مدیر

حسین امیر فرہاد

ناشر : عطاء الرحمٰن ارائیں

طابع : سید عبدالسلیم

مطبع : آفتاب عالم پریس

مقامِ اشاعت

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور۔

جلد ۴۷ —— جون ۱۹۹۴ء —— شمارہ ۶

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان —— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک —— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ : -/۱۰ روپے

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
ارجعی الیٰ ربک	محمد عمر دراز	۶
جہاد	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۸
پاکستان کی آئیڈیالوجی	اعزاز الدین احمد خاں	۲۵
ہیں کواکب کچھ....	حسین امیر فرہاد	۲۷
اشتہار	ٹرسٹ	۳۵
ذیابیطس کا علاج	چوہدری محمد لطیف	۳۶
نغمۂ جاں فضا	علی محمد چدھڑ	۳۸
حقائق و عبر	ادارہ	۴۵
اشتہار		۴۸
حدود میں عورتوں کی گواہی	رحمت اللہ طارق	۴۹
ربّ العالمین	ایم البشیر احمد	۵۵
قرآن اور نفاذِ اسلام	راجہ عبدالرزاق	۶۶
بچوں کا صفحہ	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۷۳
انگریزی مضمون	پروفیسر شمیم انور	۷۶

لمعات

مذہبی جنونیت

آجکل مساجد بحث و تکرار کے اکھاڑے بنے ہوئے ہیں۔ اکثر جگہوں پر موضوعِ سخن یہ دیکھا ہے کہ حضورؐ بشر تھے یا نُور۔ یہ بندگانِ خدا یہ نہیں سوچتے کہ بروز قیامت ہم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ نبیؐ نور تھے یا بشر۔ بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ حضورؐ کے توسط سے جو ضابطۂ حیات (قرآن کریم) اللہ تعالیٰ نے نازل کیا تھا اس پر کہاں تک عمل کیا۔ ان مساجد میں جو دلائل و براہین سے قائل نہیں ہوتا اسے بم یا گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔

یہ جو آئے دن مسجدوں میں دھماکے ہوتے ہیں ان کا یہی سبب تو ہوتا ہے۔ اگر ان کے پیچھے بھارتی تخریب کار ہوتے تو وہ مسجدوں کے بجائے ان جگہوں کو نشانہ بناتے جہاں زیادہ خلقت ہوتی ہے۔ مسجدوں میں تو بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ یہ دھماکے مختلف عقائد کے مذہبی جنونی اپنے مخالفین کو ہٹانے کے لئے کرتے ہیں اور اسے کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔

مسجدیں کبھی امن اور سلامتی کا گھر کہلاتی تھیں۔ آج مسجد سے زیادہ غیر محفوظ اور غیر مواتن جگہ اور کوئی نہیں۔ اگر مذہبی اجارہ داروں نے اپنا رویہ نہ بدلا تو معاذ اللہ ایک دن مسجدیں ویران ہو جائیں گی۔

ڈاکٹر فاروق کا واقعہ ہمارے سامنے ہے جو پوری انسانیت کے ماتھے پر ایک بدنما داغ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کھیالی (گوجرانوالہ) میں ایک شخص ڈاکٹر سجاد فاروق نام کا چھ بچوں اور بیوی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ قرآن حافظ تھا۔ پڑوس والوں سے عداوت تھی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۹۴ء وہ قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ بیوی دو بچوں کے ساتھ اگربتی لینے گئی تھی۔ واپس آئی تو گھر میں اور باہر لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ شوہر نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ بیوی نے کھڑکی میں سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ شوہر ڈاکٹر فاروق نے بتایا کہ کوئی علم نہیں۔ پڑوسن نے واویلا مچایا کہ میں نے قرآنِ پاک شہید کیا۔ کچھ دیر بعد پولیس آئی۔ مشتعل ہجوم کو تسلی دی اور ڈاکٹر فاروق کو پولیس چوکی لے گئی۔

مگر اسی گھڑی قریب کی مسجد سے (جس میں ڈاکٹر فاروق کا آنا جانا نہیں تھا) اعلان ہوا کہ عطائی ڈاکٹر فاروق

کا قتل روا ہے کیونکہ اس نے قرآنِ پاک شہید کیا۔۔۔۔۔ قریب ہی ٹینٹ لگا تھا۔ کسی جنازے میں لوگ شرکت کے لئے آئے تھے۔ وہ لوگ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے ' عطائی کو لوگوں نے عیسائی سمجھا۔ یہ مل کر پولیس چوکی گئے جہاں ہتھکڑیوں میں ڈاکٹر فاروق بیٹھا تھا۔ اسے باہر لائے اور مارنا شروع کیا۔

اس کی کوئی بات نہ سُنی گئی۔ قریب سے ایک اینٹوں بھری ٹرالی گذر رہی تھی۔ اسے روکا گیا اور اینٹیں اُٹھا اٹھا کر ماری گئیں۔ اکثر مارنے والوں کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ معاملہ کیا ہے' ثواب کی خاطر انہوں نے شرکت کی۔

جب ڈاکٹر فاروق نے دم توڑ دیا تو اس پر تیل چھڑک کر آگ لگادی گئی۔ یعنی اسے آگ لگادی گئی جس کے سینے میں قرآن تھا۔

پھر دو جوانوں نے اس کی لاش کو موٹر سائیکلوں کے پیچھے باندھا اور بازاروں میں گھسیٹتے پھرے۔ تب کہیں پولیس نے مداخلت کی' لاش قبضے میں لی' لڑکوں کو حراست میں لیا۔

اخباری اطلاع کے مطابق کمشنر اپنی گاڑی سے تمام کاروائی دیکھتے رہے اور اُترے نہیں۔

بعد میں اسی مسجد میں ڈاکٹر فاروق کے لئے قرآن خوانی ہوئی اور نفل پڑھے گئے جس مسجد سے اس کے قتل کا اعلان ہوا اور ڈاکٹر فاروق کے قاتل فاتحہ میں شریک ہوئے۔ اسے کہتے ہیں۔

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

تمام اہلِ محلہ اور اس کے جاننے والوں نے کہا کہ ڈاکٹر فاروق ایک دیندار شخص تھا۔ اس سے ایسی امید نہیں کی جاسکتی کہ اس نے قرآنِ پاک شہید کیا ہوگا۔

ابتدا میں اخبارات نے لکھا تھا کہ اس کی بیوی نے یہ بیان دیا کہ میرے شوہر نے قرآن شہید کیا۔ مگر بیوی تو گھر میں موجود نہ تھی۔ پھر اخبارات نے لکھا کہ ڈاکٹر فاروق تلاوت کررہے تھے' چائے آگ پر پڑی تھی' جب اُبل کر گرنے لگی تو ڈاکٹر اٹھا۔ مگر جھولی میں جو قرآن پاک تھا وہ چولہے پر گر پڑا جس سے چند اوراق جھُلس گئے۔ تب ڈاکٹر فاروق نے بآوازِ بلند افسوس کا اظہار کیا جو پاس کھڑی پڑوسن نے سُن لیا اور باہر شور مچایا کہ عطائی ڈاکٹر فاروق نے قرآنِ پاک کو شہید کردیا۔

مگر ڈاکٹر فاروق کی بیوی نے بتایا کہ کچھ بھی نہیں ہوا' صرف پڑوسن سے عداوت تھی جس کی وجہ سے میرے شوہر کو قتل کردیا گیا۔

کمال کی بات یہ ہے کہ حکومت اس تمام عرصہ خاموش رہی۔ البتہ ۵ مئی کو اسسٹنٹ کمشنر گوجرانوالہ نے رپورٹ مکمل کی' کہا کہ حافظ سجاد فاروق نے قرآنِ پاک جلایا ہے۔

قارئین کرام! واقعہ کچھ بھی ہو' وہ مجرم تھا یا نہیں تھا' یہ تحقیق پولیس کا کام تھا' سزا کا تعین عدالت کا کام

تھا۔ ہم جس دین کے پیروکار ہیں اس کے جتنے بھی تعزیراتی احکامات ہیں وہ کسی فردِ واحد کے لئے نہیں بمثلاً اگر چور کے ہاتھ کاٹنے کی بات ہو تو یہ ہر شخص کا کام نہیں۔ حتیٰ کہ جس کی چوری ہوئی ہے وہ بھی چور کا ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ یہ کام عدلیہ کا ہے افراد کا نہیں۔ سزا سے مقصد مجرم کی اصلاح اور قیامِ امن ہے نہ کہ انتقام۔ واضح رہے کہ اس المناک واقعہ میں بھی مسجد اور لوڈ اسپیکر ملوث ہے)۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم اس معاملے میں ہماری کیا راہنمائی کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ

کسی پر بہتان، تہمت یا الزام لگانا گناہ ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیئے اور اگر کسی پر الزام دھر دیا جائے، تو تحقیق لازم ہے۔

فرمانِ خداوندی ہے۔

وَ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۴۹/۱۱)

اور کسی پر عیب (تہمت) نہ لگاؤ۔

دوسرے مقام پر فرمایا۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ (۴۵/۷)

ہر جھوٹے الزام لگانے والے پر افسوس ہے۔

فرمایا۔

لَوْ لَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ؕ..... (۲۴/۱۳)

یہ افتراء پرداز اپنی بات کی تصدیق کے لئے چار گواہ کیوں نہ لائے۔ تو جب یہ گواہ نہیں لا سکتے تو خدا کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔

ڈاکٹر فاروق کے کیس میں ایک گواہ تھی (پڑوسن پردین) جو غائب ہے۔ دوسری جگہ تہمت لگانے والوں اور کسی کو اذیت دینے والوں کے متعلق ارشاد ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (۳۳/۵۸ ; ۴/۸۳)

اور جو لوگ مردوں اور عورتوں پر ایسی تہمت لگائیں اور انہیں اذیت دیں وہ صریحاً گناہ کا بوجھ سر پر رکھتے ہیں۔

فرمایا کہ اگر ایسی کوئی بات آپ کے علم میں آئے تو تحقیق لازم ہے۔ فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ......(۴۹/۶)

مومنو اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کرلیا کرو۔ مبادا کسی قوم
کی نادانی سے نقصان پہنچا دو پھر تمہیں اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے گا۔

مگر ڈاکٹر فاروق کے معاملے میں کوئی تحقیق نہیں ہوئی۔ اسے ہلاک کر دیا گیا۔ اب ہر شخص نادم ہے، آخر کیوں۔ جلدبازی سے کام لیا گیا۔ دینی تقاضے آخر کیوں نہیں پورے کئے گئے۔ یہ خون کس کی گردن پر ہے۔

۱۔ عوام کی گردن پر　　۲۔ اہلِ مساجد کی گردن پر　　۳۔ یا انتظامیہ کی گردن پر۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جس نے کسی ایک شخص کی جان لی اس نے تمام انسانوں کو گویا قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک کی جان بچائی گویا اس نے تمام انسانیت کی جان بچائی (۵/۳۲)۔ مسلمان کے لئے اس آیت پر عمل کرنا لازم ہے۔

کِتَابُ اللّٰه

رسول اللہ (صلعم) نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں (وفات سے تین ماہ قبل) فرمایا۔

وَ قَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ
اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ ـــ كِتَابُ اللّٰهِ۔

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں جس سے اگر تم وابستہ رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے ـــ وہ چیز کتاب اللہ ہے۔

(مسلم۔ نسائی۔ ابوداؤد)

محمد عمر دراز

ارجعی الٰی ربک

طلوعِ اسلام بابت ماہ مئی ۱۹۹۴ء کے لمعات دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آخر کسی گوشے کی طرف سے تو ہمارے صاحبانِ اقتدار کے ایک نہایت ہی غلط اور گمراہ کُن طرزِ عمل پر جرأت مندانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

کیا خوب لکھا ہے کہ مزارات پر حاضری اور دعائیں' فیلڈ مارشل ایوب خاں، ذوالفقار علی بھٹو یا جنرل ضیاء الحق میں سے کسی کے اقتدار کو بھی نہ بچا سکیں۔

یہ صرف طلوعِ اسلام ہی کا حصّہ ہے کہ وہ کسی کے بھی (کسے باشد) خلافِ قرآن عمل یا اقدام پر نہ صرف قرآنِ کریم کی روشنی میں ان پر تبصرہ کرتا ہے بلکہ اس امر کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ اللہ کے نزدیک صحیح طرزِ عمل کیا ہے۔

مذکورہ لمعات پر چند نکات کا اضافہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ارشادِ ربانی ہے کہ

وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ
لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ؁ (۴۶/۵)

"اس شخص سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کو چھوڑ کر ایسی ہستیوں کو پکارے (یعنی ان سے مدد کا طلب گار ہو) جو قیامت تک ان کی پکار کا جواب نہ دے سکیں۔ حتیٰ کہ انہیں اس کا علم بھی نہ ہو کہ کوئی انہیں پکار رہا ہے۔"

مزارات پر دعائیں مانگنے والے اس عقیدہ کے تحت ایسا کرتے ہیں کہ یہ لوگ مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں اور اللہ اپنے مقرب بندوں کی دعائیں ضرور قبول کرتا ہے۔ لیکن دیکھئے محولہ بالا آیتِ جلیلہ میں کس قدر واضح بات کی گئی ہے کہ وہ تو ان کی پکار کا علم ہی نہیں رکھتے اور اسی لئے وہ قیامت تک ان کی پکار کا جواب نہیں دے سکتے۔

اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو یہ پکارتے ہیں اور ان سے دعائیں مانگتے ہیں وہ تو :-

۱) خود خدا تک پہنچنے کے وسیلے ڈھونڈتے ہیں (۱۵/۵۷)۔
۲) اپنی ذات کے لئے بھی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتے (۱۶/۱۳)۔
۳) ان کی تکلیف دُور کرنے یا اسے بدل ڈالنے کا اختیار نہیں رکھتے (۱۷/۵۶)۔
۴) کسی امر کا فیصلہ نہیں کر سکتے (۴۰/۲۰)۔
۵) کسی کی شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے (۴۳/۸۶)۔ اور
۶) وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے (۳۵/۱۳)۔

قرآنِ کریم کے ان واضح اور غیر مبہم ارشادات کی روشنی میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کے آستانہ پر تضرع اور دعا طلبی یا تو جہالت ہو سکتی ہے یا عوام کو بے وقوف بنانے کا ایک حربہ" صورت کوئی بھی ہو جائز نہیں کہلا سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہنے کے بعد کہ

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ (۲/۱۸۶)۔

اے رسولؐ! اگر یہ بندے میرے متعلق پوچھیں تو کہیئے کہ میں قریب ہی ہوں اور ہر پکارنے والے کی جب وہ پکارتا ہے پکار کا جواب دیتا ہوں۔

یہ ارشاد فرمایا کہ

فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ۝ (۲/۱۸۶)

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری مانگ پوری ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری رہنمائی (قرآن) کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھو اور میری اطاعت کرو (میری باتوں کا جواب دو) اس طرح کامیابی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے آجائے گا"

لہٰذا یہ ہے دعا مانگنے کا وہ طریقہ جس سے دعائیں بارگاہِ الٰہی میں مستجاب ہوتی ہیں۔

(محمد عمر دراز)

دُعا سے مفہوم کیا ہے اور قرآنِ کریم کی روشنی میں دعا مانگنے کا کیا مطلب ہے اس پر مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کے رشحاتِ قلم آئندہ شمارہ میں پیش کئے جائیں گے۔
(مدیر)

علامہ غلام احمد پرویزؒ

جہاد

اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ چاہے بوسنیا یا کشمیر ہو یا افغانستان ہر جگہ خونِ مسلم کی ارزانی ہے۔ عجیب نفسانفسی کا عالم ہے۔ جس پر پڑی ہے وہی جھیل رہا ہے۔ حالانکہ فرمانِ خداوندی ہے۔

وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ (۴۹/۹)

اور اگر مومنوں میں سے دو فریق لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ (۴۹/۱۰)

مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں ان میں صلح کرا دیا کرو۔

مگر پرائی آگ میں کون کودتا ہے۔ کشمیر میں نہتے مسلمانوں پر وہ ظلم توڑے جا رہے ہیں کہ لوگ نازیوں کو بھول گئے۔ لڑکیوں کی اجتماعی آبروریزی تو روز کا معمول ہے۔ وہ پکار پکار کر پاکستانی مسلمان بھائیوں کو مدد کے لئے بلا رہے ہیں مگر ہمارے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ حالانکہ ان کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ فرمایا۔

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ...... (۴/۷۵)

ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے پروردگار! ہم کو اس شہر سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما۔

ہماری اس بے حسی کو دیکھتے ہوئے آج پھر ہمارا مکار دشمن بھارت ہماری طرف بڑھ رہا ہے، اس کے پاؤں کی آہٹ آج پھر سنائی دے رہی ہے۔ مشرقی پاکستان کو اس نے جس ہتھیار (نیشنلزم) سے جدا کیا تھا

تی جارحانہ کھیل رہا ہے۔ اس نے اپنی مسلح افواج کو کیل کانٹے سے لیس کر دیا اور حملہ آور ہونے کے لئے صف بندی کر رہا ہے، ہمارے سندھ کے بارڈر پر دو صحرائی کور تین ٹینک ڈویژن اور مکانائزڈ انفنٹری ڈویژن، سٹرائیک فورس میں ۲۰ ٹینک اور لاتعداد توپیں۔ کشمیر میں ۱۳ لڑاکا اسکواڈرن، پانچ لاکھ بھارتی فوج اشارے کی منتظر ہے۔ پرتھوی میزائل کا کامیاب تجربہ بھی کر چکا ہے۔

ہمارے سیاسی قائدین ایک دوسرے پر الزامات اور جوابی الزامات سے فارغ نہیں۔ ہمیں چوکس اور بیدار رہنا ہوگا۔ اس وقت ملی طاقت کی اشد ضرورت ہے جو مکمل یک جہتی اور اتحاد کے بغیر ممکن نہیں ہمیں متمسک بالقرآن ہونا چاہیئے۔ آیئے دیکھیں کہ اس معاملے میں قرآن ہماری کیا راہ نمائی کرتا ہے۔

محترم علامہ غلام احمد پرویزؒ صاحب کا ہر خطاب اس قابل ہے کہ بار بار شائع کیا جائے۔ مگر انہوں نے لاہور کے جلسۂ عام میں جہاد کے موضوع پر قوم سے خطاب فرمایا تھا جو ایک بار شائع ہو چکا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ایک بار پھر اسے شائع کیا جائے۔ (ادارہ)

برادرانِ عزیز! مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں جہاد کے عنوان پر قرآنِ کریم کی روشنی میں، آپ احباب سے خطاب کروں۔ جہاد کے معنی ہیں کسی مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا۔ ایمان اس مقصد کو متعین کرتا ہے جو مومن کا منتہائے نگاہ قرار پاتا ہے اور عملِ صالح اس جدوجہد کا نام ہے جو اس مقصد کے حصول کے لئے کی جائے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اسلام اور جہاد اور مومن اور مجاہد مترادف الفاظ ہیں۔ اسلام نام ہی یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا ہے اور اسی کو جہاد کہا جاتا ہے ـــــ یعنی مسلسل حرکت، پیہم سعی و عمل، لگاتار کوشش، مدام جدوجہد ـــــ اور اسی کا دوسرا نام زندگی بھی ہے۔

جہاد کے معنی

علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر! رازِ دوامِ زندگی

بلکہ یہ کہ ـــــ زندگی جہد است و استحقاق نیست ـــــ یعنی زندگی یونہی بیٹھے بٹھائے بطور حق کے نہیں مل جاتی۔ اسے مسلسل سعی و عمل اور پیہم کد و کاوش سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ .... (۸/۲۴) "اے جماعتِ مومنین! تم خدا اور

رسولؐ کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف دعوت دے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہے اور اس امتیاز کو، انسانی زندگی کے ہر گوشے میں، اور ہر قدم پر، یہ کہہ کر نمایاں کر دیا کہ لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ ...... وَ الْمُجٰهِدُوْنَ جدوجہد کرنے والے اور بیٹھے رہنے والے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا (۴/۹۵) خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے جدوجہد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر بڑی فضیلت حاصل ہوتی ہے اور ان کے لئے اجرِ عظیم ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، جہاد، زندگی کے ہر گوشے میں مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ لیکن اس جدوجہد کا آخری گوشہ وہ ہوتا ہے جہاں ایک مردِ مومن، اپنے بلند و بالا مقصد کے حصول کے لئے سربکف

قتال

میدانِ جنگ میں آجاتا ہے۔ اس مرحلہ کے لئے قرآنِ کریم نے قتال کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو جہاد میں قتال بھی شامل ہوتا ہے لیکن قتال جہاد کے ایک (اور آخری) گوشے کا نام ہے۔ یا یوں کہئے کہ قتال جہاد کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ جس موضوع کے متعلق مجھ سے خطاب کرنے کے لئے کہا گیا ہے اس سے مراد جہاد کا یہی آخری گوشہ، یعنی قتال ہی ہے۔ اس لئے میری معروضات بھی سرِدست، اسی گوشہ تک محدود رہیں گی اور یہی وقت کا تقاضا بھی ہے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

(•)

امن و سلامتی کا دین

اسلام، امن و سلامتی عطا کرنے والا نظامِ زندگی ہے (خود اسلام کے مفہوم میں یہ حقیقت داخل ہے)۔ خدا کا ایک نام السّلام اور دوسرا المؤمن ہے۔ المؤمن کے معنی ہیں امنِ عالم کا ذمہ دار۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مومن بھی خدا کی اسی صفت کا آئینہ دار ہے۔ سب سے پہلا عبدِ مومن خود رسول ہوتا ہے اس لئے حضورؐ کے متعلق فرمایا کہ وہ رسولِ امین تھے۔ (خدا کا ہر رسول امین ہوتا تھا)۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو جماعتِ مومنین کا اوّلین فریضہ دنیا میں امن قائم کرنا اور اسے برقرار رکھنا ہے۔ اس امت کی بعثت کے متعلق کہا گیا ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۰۹) تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے اٹھا کھڑا کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ نوعِ انسان کی بھلائی میں امن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اگر دنیا میں امن ہی قائم نہ رہے تو بھلائی کا امکان کہاں ہوگا۔ امن کی ضد، فساد ہے اور فساد کو خدا نے انسانیت کی عدالت میں سنگین ترین جرم قرار دیا ہے۔ مفسدین اس کے نزدیک بدترین مجرم ہیں۔ فساد میں انسانی جانیں تلف ہو جاتی ہیں اور انسانی جان کی قیمت اس کے نزدیک اتنی بڑی ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یاد رکھو! جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق

قتل کر دیا یوں سمجھو کہ اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک جان کو بھی بچا لیا اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کو زندگی عطا کر دی (۵/۳۲)۔

اس سے ظاہر ہے کہ جماعتِ مومنین خود امن میں رہے گی اور دوسروں کے امن میں کبھی خلل انداز نہیں ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب دنیا کی سرکش اور مستبد قوتیں، امنِ عالم میں خلل انداز ہوں تو اس سلسلہ میں جماعتِ مومنین پر کوئی فریضہ عائد ہوتا ہے یا نہیں ؟ کیا ایسی صورت میں انہیں خاموشی سے بیٹھے " یاد اللہ " میں مصروف رہنا چاہیئے یا کچھ اور کرنا چاہیئے ؟ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ امنِ عالم کا قائم رکھنا خدا کی ذمہ داری ہے۔

فساد

لیکن انسانی دنیا میں خدا اپنی ذمہ داریاں خود انسانوں کے ہاتھوں سے پوری کرایا کرتا ہے چنانچہ اس مقام پر اس نے کہا ہے کہ

وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ (۲/۲۵۱)

اگر خدا سرکش اور مستبد قوتوں کی روک تھام دوسرے لوگوں کے ہاتھوں نہ کراتا، تو دنیا میں فساد برپا ہو جاتا۔

اور فساد کی تشریح دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی کہ

وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۲۲/۴۰)

اگر خدا مستبد قوتوں کی روک تھام دوسری جماعتوں سے نہ کراتا رہتا تو (دنیا سے مذہبی آزادی ختم ہو جاتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ) مختلف اہلِ مذاہب کی پرستش گاہیں ــــ یہودیوں کے صومعے، عیسائیوں کے گرجے، راہبوں کی کوٹھڑیاں، مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا ذکر اکثر ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہتی، سب ایک دوسرے کے ہاتھوں منہدم ہو جاتیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی رُو سے مذہبی آزادی کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اور اسے برقرار رکھنے کے خدا کیا انتظام کرتا ہے۔ بہرحال، ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، امنِ عالم برقرار رکھنے کی خدا کی ذمہ داری یوں پوری ہوتی ہے کہ جب کوئی قوم نشۂ قوت سے بدمست ہو، دوسروں کے امن میں خلل انداز ہو، تو اس کی روک تھام دوسری جماعتوں کے ہاتھوں سے کرائی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دوسری جماعت، جماعتِ مومنین کے سوا اور کون ہو سکتی ہے ؟ یہی وہ جماعت ہے جو انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریوں کے پورے کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسی لئے مندرجہ بالا آیت کے آخر میں فرمایا کہ وَ لَيَنْصُرَنَّ

اللہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ (۲۲/۴۰) جو خدا کی مدد کرتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوجائے خدا کا قانون اس کی مدد کرتا ہے۔ اور اسے ایسا کرنا بھی چاہیئے۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ وَ کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ (۳۰/۴۷) جماعتِ مومنین کی مدد کرنا ہم پہ لازم ہوجاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ سرکش اور مستبد قوتوں کی روک تھام کس طرح کی جائے گی؟ اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ جب یہ دیکھا جائے کہ ان کی روک تھام کے لئے تمام مصالحانہ تدبیریں ناکام ہوچکی ہیں اور یہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے تیار ہی نہیں تو پھر اس کے سوا چارۂ کار ہی کیا رہ جاتا ہے کہ ان کی روک تھام قوت سے کی جائے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے قرآن کریم نے کہا کہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا

شمشیر کا نزول

بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل اور ضوابط قانون دے کر بھیجا اور میزانِ عدل بھی۔ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ تاکہ لوگ عدل کو قائم رکھ سکیں۔ اس کے بعد ہے وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ان کے ساتھ ہم نے فولاد (شمشیر خارہ شگاف) بھی نازل کیا جس میں بڑی سختی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے بے شمار فائدے۔ یہ کیوں نازل کی گئی؟ اسی مقصد کے لئے جس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ یعنی خدا کی مدد کرنے کے لئے۔ وَ لِیَعْلَمَ اللہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ اِنَّ اللہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ (۵۷/۲۵) تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ کون، خدا اور اس کے رسولوں کی ایسے مراحل میں مدد کرتا ہے جن میں انسان کی ہر قسم کی مشکلات اور مصائب برداشت کرنے ہوتے ہیں اور ان کے نتائج ہنوز نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اس سے دنیا کے سامنے یہ حقیقت آجاتی ہے کہ خدا کا یہ نظام کس قدر غلبہ اور قوت کا مالک ہے۔

آپ نے غور کیا کہ اس مقام پر اسلام، مذاہب کی دنیا سے الگ ہوکر کس طرح ایک عملی نظامِ زندگی (دین) کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ دنیائے مذاہب میں ایسے مقام پہ کہا جائے گا کہ جب سرکش قوتیں ظلم و زیادتی پر اُتر آئیں تو خدا پرست انسان کو چاہیئے کہ وہ ان مظالم کو صبر اور سکون سے برداشت کرے۔ وہ اگر ایک گال پر طمانچہ ماریں تو دوسرا گال ان کے سامنے کردے۔ لیکن اسلام تو نظامِ حیات ہے۔ وہ دنیا میں عملاً رہنا اور اس کا امن قائم رکھنا سکھاتا ہے۔ اس کے لئے اس نے کہا کہ جس خدا نے دلائل و براہین اور ضوابطِ قانون نازل کئے ہیں اسی نے ان کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف بھی نازل کی ہے اور ان دونوں کے مجموعے سے دین ترتیب پاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تُو نے کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار

اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

تلوار اور قرآن

یہ اس بیت کا مصرعِ اوّل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا دوسرا مصرع کیا ہے جس کے ساتھ مل کر یہ مصرعِ اوّل، مکمل شعر بنتا ہے؟ اس کے لئے انہوں نے جاوید نامہ میں کہا ہے کہ ـــ مومناں را تیغ با قرآں بس است ـــ یعنی قرآن اور تلوار، دونوں مل کر نظمِ زندگی کا مکمل شعر بنتے ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند

کائناتِ زندگی را محور اند

تلوار (قوت) قرآن کی حفاظت کرتی ہے کہ سرکش اور بیباک قوتیں، اس ضابطۂ زندگی کو عاجز و ناتواں بنا کر دین کو "مذہب" میں تبدیل نہ کر دیں اور اس طرح خود من مانی کرنے لگ جائیں۔ اور قرآن تلوار کی حفاظت کے لئے ہے کہ اسے صرف اس مقام پر استعمال کیا جائے جہاں قانونِ خداوندی اس کی اجازت دے۔ ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ وہ کون سے مقامات ہیں جہاں قرآن، تلوار کے استعمال کی اجازت دیتا ہے، اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔

یہ واضح ہے کہ اسلام ایک نظامِ زندگی ہے جو ایک آزاد خطۂ زمین ہی میں متشکل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ یہ خطۂ زمین، ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رہے، کہ اگر یہی محفوظ نہ رہا، تو جماعتِ مومنین خود ہی امن میں نہیں رہ سکے گی۔ چہ جائیکہ وہ امنِ عالم کے قیام کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو

اپنی سرحدوں کی حفاظت

سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مملکت کی سرحدوں کو مضبوط رکھا جائے اور ہر خطرہ کے مقابلہ کے لئے پوری پوری تیاری کی جائے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم میں ہے۔

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (۸/۶۰)

ان کی روک تھام کے لئے تم اپنی امکان بھر قوت فراہم کرو۔ حفاظت کے لئے اپنی سرحدوں پر فوجی چھاؤنیاں ڈالو۔ تاکہ اس سے تمہارے اور تمہارے نظامِ خداوندی کے دشمنوں کے دل

میں تمہاری دھاک بیٹھی رہے۔ ان دشمنوں کے علاوہ ان دشمنوں کے دلوں میں بھی جنہیں ابھی تم نہیں جانتے لیکن خدا کو ان کا علم ہے۔

اس لئے کہ جب تک کسی ملک کی سرحدیں مضبوط اور محکم نہیں ہوں گی، وہ ملک محفوظ نہیں رہ سکے گا اور جب ملک ہی محفوظ نہیں ہو گا تو اس کا نظام کس طرح محفوظ اور برقرار رہ سکے گا؟

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

پھول کی حفاظت کے لئے کانٹوں کا وجود ضروری ہے۔ لیکن ان کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ ان کا مقصد پھول کی حفاظت ہے، نہ کہ خواہ مخواہ راہ چلتوں کے ہاتھوں کو زخمی کرنا۔

یہ تو رہی حفاظتی تدابیر۔ اگر سرکش قوتیں ان تدابیر کے باوجود، آگے بڑھتی چلی آئیں تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب ظاہر ہے لیکن اس جواب کی اہمیت کو سمجھنے کے اس پسِ منظر کو سامنے لانا ضروری ہے جس میں یہ جواب دیا گیا تھا۔ نبی اکرمؐ —— اور آپؐ کے رفقاء کی مختصر سی جماعت نے تیرہ برس تک مکہ میں، ہر قسم کے مظالم برداشت کئے اور بالآخر اپنا گھر بار، خویش و اقارب، اسباب و متاع چھوڑ کر مدینہ چلے آئے۔ لیکن ان مخالفین نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور ایک لشکرِ جرار لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے۔ اس مقام پر خدا

جنگ کی اجازت

کی طرف سے یہ وحی نازل ہوئی کہ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔ یہ لوگ جن پر اس قدر ظلم و زیادتی کی جا رہی ہے انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ یہ بھی میدانِ جنگ میں اُتر آئیں۔ اس کے سوا اب کوئی اور چارہ کار ہی نہیں۔ اور چونکہ یہ ظلم اور زیادتی کی روک تھام کے لئے میدانِ جنگ میں آئیں گے اس لئے وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ۔ خدا ان کی مدد کرے گا۔ نِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (۲۲/۳۹) یہ وہ مظلوم لوگ ہیں جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا، صرف اس جرم کی پاداش میں کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے۔ دوسرے مقام پر ہے وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ جو لوگ تم سے جنگ کرنے کے لئے یوں اُمنڈ آئے ہیں، تم ان سے جنگ کر سکتے ہو۔ لیکن تمہاری یہ جنگ فی سبیل اللہ ہو گی۔ یعنی حق و صداقت کی حفاظت کی خاطر۔ اور اس کے بعد ہے۔ وَ لَا تَعْتَدُوْا (۲/۱۹۰) تم ان کے خلاف جنگ تو کر سکتے ہو لیکن حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے، ظلم اور زیادتی نہیں کر سکتے۔ جوشِ انتقام میں حدود فراموش نہیں کر سکتے۔ "دشمن سے بھی عدل کرنے" کی جو تاکید خدا نے کی ہے تم اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔

آپ نے دیکھا کہ جہاں تلوار، قرآن کی حفاظت کے لئے اٹھ رہی تھی، وہیں تلوار کی حفاظت کے لئے قرآن آگے بڑھ آیا اور اسے کہہ دیا کہ تم اس حد تک جا سکتی ہو۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ تلوار کے اس حد تک جانے کا مقصد کیا ہے؟ وہی جسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (۸/۳۹) تم ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ فساد مٹ جائے۔ یعنی دین کا معاملہ صرف اللہ کے لئے رہ جائے۔ اس میں کوئی مداخلت نہ کر سکے۔ ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔

یہاں تک معاملہ اپنی حفاظت کے لئے جنگ کرنے کا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ جماعت اس لئے وجود میں لائی گئی تھی کہ یہ خود محفوظ رہے اور بس! کیا ان کا وجود مقصود بالذات تھا یا کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ؟ اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ یہ جماعت پیدا اس لئے کی گئی تھی کہ یہ ظلم اور زیادتی کی روک تھام کرے۔ یہ امنِ عالم کے برقرار رکھنے کی ذمہ داری قرار دی گئی تھی۔ اس لئے انہیں المومنون کہا گیا تھا۔ اگر آپ اس ایک نکتہ پر غور کریں گے تو آپ کو "اسلامی قومیت" اور عام دنیاوی قومیت کا فرق نمایاں طور پر نظر

قوم میں فرق

آجائے گا۔ دنیا کی ہر قوم اپنے لئے جیتی ہے۔ اس کا مقصدِ زندگی اپنے آپ کو محفوظ اور مستحکم رکھ کر اپنے لئے زیادہ سے زیادہ قوت، دولت، ثروت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن امتِ مسلمہ میں اس لئے زندہ رہتی ہے کہ وہ ہر مظلوم، کمزور، ناتواں کی حفاظت کا موجب ہے۔ اس کا مقصد خود تیر کر ساحل تک پہنچ جانا نہیں ہوتا۔ ڈوبنے والوں کو بچانا بھی ہوتا ہے۔ اسی کا نام "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔ اسی لئے کہا گیا کہ یہ فی سبیل اللہ جنگ کرتے ہیں اور دوسری قومیں فی سبیل الطاغوت جنگ کرتی ہیں (۴/۷۶)۔ لہٰذا دنیا میں کہیں سے بھی مظلوم مدد کے لئے پکارے ——— اور وہ کوئی بھی ہو——— ان کا فریضہ ہے کہ یہ اس کی مدد کے لئے پہنچیں۔ یہ ہے وہ مقام جہاں انہیں جنگ کی "اجازت" نہیں بلکہ جنگ کی تاکید کی جاتی ہے۔ سورۂ نساء میں دیکھئے۔ کیسے بلیغ اور موثر انداز میں اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لایا گیا ہے۔ فرمایا: وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اے جماعتِ مومنین! تمہیں کیا

جنگ کی تاکید

ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اٹھتے؟ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ تم سنتے نہیں ہو کہ کمزور و ناتواں مظلوم و مقہور مرد، عورت، بچے کس طرح پکار پکار کر کہہ رہے ہیں اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمارے لئے اس

بستی سے نکلنے کا کوئی سامان پیدا کر دے جس کے رہنے والے اس قدر ظلم اور زیادتی پر اُتر آئے ہیں۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (۴/۷۵) ہمارا کوئی والی وارث اور حامی و ناصر نہیں۔ تو اپنی طرف سے کسی کو ہمارا والی اور مددگار بنا کر بھیج تاکہ وہ ہمیں اس ظلم و تعدی سے نجات دلائے۔

آپ اس حقیقت پر غور کیجئے کہ یہ مظلوم و ناتواں، خدا کو مدد کے لئے پکار رہے ہیں اور خدا اس جماعت مومنین سے کہہ رہا ہے کہ تم سنتے نہیں کہ وہ کس طرح ہمیں مدد کے لئے پکار رہے ہیں! تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟ یہ وہی حقیقت ہے جسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں انسانی ہاتھوں سے پوری ہوتی ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھوں سے یہ خدائی ذمہ داریاں پوری ہوتی ہیں انہیں خدا نے حزب اللہ (خدا کی پارٹی) کہہ کر پکارا ہے اور ان کے مخالفین کو حزب الشیطان (۲۲ — ۵۸/۱۹) اور اس عظیم حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ جب ان دونوں پارٹیوں کا مقابلہ ہوگا تو خدا کی پارٹی ہمیشہ غالب رہے گی۔

اسلامی جنگیں

اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اسلام میں جنگ مدافعانہ (DEFENSIVE) ہوتی ہے یا محاربانہ (OFFENSIVE)۔ اور مخالف اور موافق گوشوں سے اس سوال کے عجیب و غریب جوابات دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ اسلام میں جنگ مدافعانہ ہوتی ہے۔

لیکن اس مدافعت کا تصور عام دنیاوی تصور سے ذرا مختلف ہے۔ عام دنیاوی تصور یہ ہے کہ جو جنگ اپنی حفاظت کے لئے لڑی جائے اسے مدافعانہ کہا جائے گا۔ لیکن قرآن کی رُو سے جو جنگ ظالم کی روک تھام اور مظلوم کی مدافعت کے لئے کی جائے۔ خواہ وہ کہیں ہو اور کوئی ہو — اسے مدافعانہ کہا جائے گا۔ اس نقطۂ نگاہ سے اسلام کی ہر جنگ مدافعانہ ہوگی۔ یعنی دنیا میں ظلم اور زیادتی کی روک تھام کے لئے۔ اگر جنگ کا مقصد اس کے خلاف کچھ اور ہے تو وہ جنگ محاربانہ ہے اور اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

تاریخِ اُمم کا یہ پیامِ ازلی ہے ۔۔۔ صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمین گیر کے آگے ۔۔۔ عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر ۔۔۔ ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے، خدا کی یہ پارٹی، اللہ کا یہ لشکر، ہر وقت مستعد رہتا ہے۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ

خدا اور بندے کا معاہدہ

جب کوئی شخص ایمان لا کر مومن بنتا ہے تو یہ ایمان درحقیقت خدا اور بندے کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے،

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَ اَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ ۔
مومن اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں خدا اسے جنت عطا کردیتا ہے ۔ اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ اور اگلی دنیا میں بھی جنتی زندگی ۔ لیکن یہ معاہدہ محض کاغذی کاروائی نہیں ہوتی کہ لفظی طور پر کہہ دیا جائے کہ ہم نے اپنا جان و مال خدا کے ہاتھ بیچ دیا ہے اور اس کے عوض جنت مل جائے ۔ یہ معاہدہ عملاً اس طرح پورا ہوتا ہے کہ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ (۹/۱۱۱) وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں. پھر یا تو فاتح و منصور لوٹتے ہیں اور یا اپنی جان دے دیتے ہیں. یوں اس معاہدہ کی تکمیل ہوتی ہے ۔

جب ایسا وقت آجائے تو پھر دنیا کا کوئی "نیک کام" درجہ اور فضیلت میں اس (جہاد) کا مقابلہ نہیں کر سکتا. حقیقت یہ ہے کہ "نیک کام" (اعمالِ صالح) اس امر کے مظہر ہوتے ہیں کہ انسان خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کا تحفظ چاہتا ہے. ان اقدار کے تحفظ کا طریق یہ ہے کہ جب ان میں اور طبعی زندگی کے کسی مفاد میں تصادم ہو تو ان اقدار کو محفوظ رکھا جائے اور اس طبعی مفاد کو قربان کر دیا جائے. ان طبعی مفاد میں، ان کی اپنی جان کی حفاظت سب سے زیادہ گراں بہا ہے. انسان ہر قیمت پر اپنی جان بچانا چاہتا ہے. لیکن جب انسان کی جان اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ ہو تو اس وقت جان دے کر ان اقدار کی حفاظت کر لینا بہت بڑی قربانی ہے.

جہاد کی فضیلت

ظاہر ہے کہ اس سے بڑا نیک عمل اور کونسا ہو سکتا ہے. اسی لئے فرمایا کہ اَجَعَلْتُمْ سِقَایَۃَ الْحَاجِّ وَ عِمَارَۃَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ . کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی پینے کی سبیلیں لگا دینا اور مسجد حرام کی تعمیر اور آبادکاری، اور تزئین و آرائش کے کام کرنا، اللہ اور آخرت پر ایمان لا کر اس کے راستے میں جہاد کرنے کے برابر ہو سکتے ہیں؟ تم اپنے ذہن سے کچھ ہی فیصلہ کیوں نہ کر لو، حقیقت یہ ہے کہ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰہِ . میزانِ خداوندی میں ان دونوں کا وزن یکساں کبھی نہیں ہو سکتا. ایسا سمجھنا ظلم ہے. یعنی کسی شے کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنا اور وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ - خدا کا قانون یہ ہے کہ جو ایسا کرتا ہے اس پر کامیابی کی راہیں کشاد نہیں ہوتیں. اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ ھَاجَرُوْا وَ جٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ جو لوگ ایمان لانے کے بعد ہجرت کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، اللہ کے نزدیک ان کا درجہ بہت بلند ہے. وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ . یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حقیقی معنوں میں کامیاب و کامران کہا جا سکتا ہے. یُبَشِّرُھُمْ رَبُّھُمْ

بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ (۲۳-۱۹/۹) ان کا نشوونما دینے والا انہیں رحمت و رضوان و جنت کی بشارت دیتا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے نزدیک ان کا اجر بہت بڑا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جب جہاد کا وقت آجائے تو پھر وہ بڑے سے بڑا کام جسے ہم اپنی دانست میں بڑے ہی اجر و ثواب کا موجب سمجھتے ہیں جہاد کے مقابلہ میں کس قدر بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّاں کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اس وادیٔ عشق و مستی میں جان دینا تو خیر بعد کی بات ہے، یہاں تو مجاہدین کے قدم قدم پر نیکیاں پاؤں چومتی ہیں۔ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ۔ یہ مجاہدین بھوک اور پیاس کی جس شدت کو جھیلتے ہیں۔ جو تھکان اور مشقت یہ اٹھاتے ہیں۔ ان کا ہر وہ قدم جو اس مقام پر پڑتا ہے جہاں اس کا پڑنا دشمن کے لئے غیظ و غضب کا موجب ہو حتّٰی کہ ہر وہ نقصان جو انہیں فریقِ مخالف کی طرف سے پہنچتا ہے ان میں سے ایک ایک چیز ان کے لئے عملِ صالح بنتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ خدا کا قانونِ مکافات کسی کا حُسنِ کار از عمل ضائع نہیں ہونے دیتا۔ وَ لَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً وَّ لَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۲۱/۹) اور یہ لوگ اس مقصد کے لئے جو کچھ بھی صرف کرتے ہیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت یا جو منزل بھی وہ قطع کرتے ہیں، یہ سب ساتھ ساتھ لکھے جاتے ہیں تاکہ خدا کا قانون انہیں ان کے اعمال کا حسین ترین صلہ دے۔

خدا کے دست و بازو

ان مجاہدین کے مدارجِ بلند کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جو کچھ یہ میدانِ جنگ میں کرتے ہیں انہیں خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ۔ تم انہیں (دشمنوں کو) قتل نہیں کر رہے تھے خدا قتل کر رہا تھا۔ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۱۷/۸) تو تیر نہیں چلا رہا تھا خدا خود تیر چلا رہا تھا۔ تلواریں تمہاری تھیں، ہاتھ ہمارے تھے۔ تیر تمہارے تھے، کمانیں ہماری تھیں۔ یہ مجاہد ہیں جو خدا کے دست و بازو بنتے ہیں اس لئے کہ یہ خدا کی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے سر بکف اور کفن بدوش

میدان میں نکل آتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا کارساز

اس آویزشِ حق و باطل میں جو سعادت مند افراد اپنی جان دے دیں ان کے متعلق کہا کہ انہیں مردہ مت کہو۔

شہید مُردہ نہیں

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ۔ جو خدا کی راہ میں جان دے دیں انہیں مردہ مت کہو۔ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲/۱۵۴) یہ مردہ نہیں، زندہ ہیں۔ لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس زندگی کی کنہ وحقیقت کو سمجھ نہیں سکتے۔ دوسری جگہ ہے وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ (۳/۱۶۹) خدا کی راہ میں جان دینے والوں کے متعلق خیال تک بھی نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں۔ وہ اپنے نشوونما دینے والے کے ہاں زندہ ہیں وہ انہیں سامانِ حیات عطا کرتا ہے۔

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

یہی ہیں وہ بلند بخت، سعادت مند افراد جنہیں عرفِ عام میں شہید کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ جان دے کر اپنے ایمان کی زندہ شہادت پیش کرتے ہیں۔ یہ نظامِ خداوندی کے مبنی بر حق و صداقت ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ اس فریضہ کی ادائیگی کو تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں جس کی رُو سے امتِ مسلمہ کو شہداء علی النّاس کہا گیا ہے۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کے اعمالِ حیات کی محاسب و نگران۔ کتنا اہم تھا یہ فریضہ، اور کس حسن وخوبی سے انہوں نے اسے ادا کیا۔

اِک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

(٭)

یہ تو پھر بھی خود مجاہدین کی شہادت کا تذکرہ ہے۔ قرآنِ کریم تو مجاہدین کے گھوڑوں کی تگ وتاز کو حق وصداقت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے جب کہتا ہے کہ وَ الْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (۱۰۰/۱-۵) شہادت دیتے ہیں وہ گھوڑے جو ہانپتے ہوئے یورش کرتے ہیں۔ جو پتھروں پر اس شدت سے

پاؤں مارتے ہیں کہ ان سے آگ کی چنگاریاں اڑتی ہیں۔ جو صبح سویرے دشمن کی فوجوں پر حملہ کرتے ہیں جن کے سموں کی ٹاپ سے گرد وغبار اڑتا ہے۔ جو مردانہ وار دشمن کی صفوں کے اندر جا گھستے ہیں[1]۔ یہ سب شہادت دیتے ہیں اس حقیقت کی کہ جب انسان وحی کی روشنی میں قدم نہ اٹھائے تو یہ بڑا ہی ناقدر شناس ہو جاتا ہے اور دنیا میں فساد برپا کرتا ہے جسے روکنے کے لئے مجاہدین کے گھوڑوں کو اس طرح یورش کرنی پڑتی ہے۔

یہ تو ہیں مجاہدین کے سرفروشانہ کارنامے۔ اس شہادت گاہِ الفت کے معاملات کس قدر نازک ہیں اس کا اندازہ قرآن میں بیان کردہ ایک اور حقیقت سے لگایئے۔ ذرا تصور میں لایئے اس منظر کو کہ بدر کا میدان ہے۔ مومنین کی مٹھی بھر جماعت اپنا سب کچھ چھوڑ کر

پیٹھ موڑنے والا

اللہ کی راہ میں جان دینے کے لئے دشمن کے سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ یہ صحابہ کبارؓ کی جماعت ہے۔ یہ ان السابقون الاولون کی جماعت ہے جنہیں اللہ نے "مومنِ حقا" کہہ کر پکارا ہے۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ میدانِ جنگ میں یہ دشمن کی صفوں پر برقِ خاطف بن کر گرنے کے لئے ایسے مضطرب و بے قرار کھڑے ہیں کہ ــــ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا ــــ عین اس وقت ان سے کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو۔ دشمن کو پیٹھ دکھا کر نہ بھاگ اٹھنا۔ وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ (۸/۱۶) آج کے دن، ان میں سے جو شخص دشمن کو پیٹھ دکھائے گا بجز اس کے کہ وہ میدان میں پینترہ بدلنے کے لئے ہو یا اپنی جماعت کے ساتھ ملنے کے لئے، تو یاد رکھو، وہ خدا کے غضب کا مستحق ہو جائے گا اور سیدھا جہنم میں چلا جائے گا اور تم جانتے ہو کہ جہنم کس قدر بُرا ٹھکانا ہے۔" ظاہر ہے کہ اس جماعت میں کون ایسا ہو سکتا تھا جو دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلتا۔ یہ تاکید تو میدانِ جہاد کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے، ہمارے آپ کے لئے ہے۔

یہ ہے جہاد کی عظمت اور اہمیت قرآنِ کریم کی رُو سے۔ جہاد سے بڑھ کر کوئی اور حسنِ عمل نہیں اور اس سے گریز کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ یہی ماحصلِ دین ہے، یہی منتہائے ایمان ہے۔ یہی متاعِ حیات ہے۔

شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن ۔۔۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

---

[1] ان آیات کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے جسے میں مفہوم القرآن میں بیان کروں گا۔ (پرویزؒ)

اب ظاہر ہے کہ اگر اس کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی اور کشش زیادہ جاذب ہو جائے تو پھر ایمان باقی کہاں رہ سکتا ہے۔ دیکھئے! قرآنِ کریم نے اس عظیم حقیقت کو کس قدر واشگاف انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ قُلْ اے رسولؐ! ان برملا کہہ دو کہ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ

جہاد کی اہمیت

وَ عَشِیْرَتُكُمْ اگر تمہارے ماں باپ، تمہارے بیٹے بیٹیاں، تمہارے بہن بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارے دیگر افرادِ خاندان۔ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا تمہارا مال و دولت جسے تم محنت و مشقت سے کماتے ہو۔ وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا یا تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم اس قدر خائف رہتے ہو۔ وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا یا تمہارے مکانات و محلات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں۔ یاد رکھو! ان میں سے کوئی ایک چیز اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ تمہارے نزدیک خدا اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہو گئی فَتَرَبَّصُوْا تو تم انتظار کرو۔ حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ تا آنکہ خدا کا فیصلہ تمہارے خلاف آ جائے۔ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ○ (۹/۲۴) ایسی قوم جو سیدھی راہ کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلے اسے کامیابی کی راہ کس طرح دکھائی دے سکتی ہے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! جہاد سے گریز کرنے والی قوم کا مآل اور انجام!

جنگ کے سلسلہ میں قرآنِ کریم کس قسم کے احکام اور ہدایات دیتا ہے ـــــ معاہدات کا احترام کس قدر ضروری ہے۔ دشمن کے ساتھ صلح کرنے کی کس قدر تاکید ہے۔ دشمن کے معاملہ میں بھی عدل اور انصاف کے اصولوں پر کار آمد رہنا کس قدر ضروری ہے۔ جو تمہاری پناہ میں آ جائے اسے کس طرح اپنی حفاظت میں مامن تک پہنچانا چاہیئے۔ جنگ کے قیدیوں کو فدیہ لے کر یا بطور احسان چھوڑ دینا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ ـــ یہ موضوع الگ ہے جس کی طرف میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآنِ کریم کن حالات میں جنگ کی اجازت دیتا ہے اور کن حالات میں اس کی تاکید کرتا ہے۔ جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے

۱۔ اس خطۂ زمین کی حفاظت کے لئے جنگ کی اجازت ہے جو نظامِ خداوندی کی عملی تشکیل کا ذریعہ ہو اور

۲۔ ظلم و استبداد کی روک تھام کے لئے جنگ کی تاکید ہے، وہ خواہ کہیں بھی ہو۔ مظلوم کی آواز پر لبیک کہنا مسلمان کا اوّلین فریضہ ہے۔

موجودہ حالات

ان حقائق کی روشنی میں اب ان حالات پر غور کیجئے جو ہندوستان کی طرف سے گذشتہ پینتالیس برس میں مسلسل اور پیہم پیدا کئے جا رہے تھے جو اب اپنی انتہا

تک پہنچ چکے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان میں ہنوز، قرآنی نظام قائم نہیں ہوا لیکن اس خطۂ زمین کو حاصل ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ یہاں نظامِ خداوندی قائم کیا جائے۔ یہی پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد تھی اور اسی بنیاد پر ہمارے دعوے کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اسی کے لئے ہم نے اسے حاصل کیا تھا اور یہی ہمارا منتہا و مقصود ہے جس طرح ایک مقصد اور منتہیٰ کی حفاظت ضروری ہوتی ہے اسی طرح اس مقصد کے حصول کے ذرائع کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک خطۂ زمین ہے جسے "مسجد" بنانے کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی محفوظ نہ رہے تو "مسجد" کہاں تعمیر ہو سکے گی۔ سرزمینِ پاکستان کی اس وقت مثال وہی ہے جو ہجرتِ نبویؐ کے فوری بعد سرزمینِ مدینہ کی تھی کہ وہاں ہنوز نظامِ خداوندی متشکل نہیں ہوا تھا لیکن وہ اس نظام کی تشکیل کا ذریعہ بننے والی تھی۔ لہٰذا برادرانِ عزیز! میری بصیرتِ قرآن کے مطابق سرزمینِ پاکستان کی حفاظت ہمارے لئے جزوِ ایمان ہے۔ ہندو نے پہلے دن سے نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی اور یہ اس کی مخالفت کے علی الرغم وجود میں آگیا۔ وجود میں تو یہ آگیا۔ لیکن ہندو نے اسے دل سے کبھی قبول نہیں کیا۔ اس کی شدید آرزو یہ ہے کہ (خدا نہ کردہ) اس کے جداگانہ "آزاد" وجود کو ختم کر کے اسے پھر سے بھارت کا جزو بنا لیا جائے۔ اس کے لئے وہ مسلسل مصروفِ کوشش ہے اور اب اس مسئلہ کو اس نے انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

جہاں تک ظلم اور زیادتی کا تعلق ہے، گذشتہ سینتالیس برس میں، ہندوستان نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا — صرف ان کے اس جرم کی پاداش میں کہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہ وہ خدا کو اپنا رب کیوں مانتے ہیں۔ وہ مظلوم و ناتواں، پکار پکار کر خدا سے کہہ رہے ہیں کہ ہماری مدد کے لئے کسی کو بھیج۔ ان حالات میں مسلمانوں پر فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ ہندوؤں کے اس ظلم و ستم کی روک تھام کریں۔

ہندوستان سے جنگ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ ہماری حکومت کا ہے۔ وہ حالات کے مطابق جو فیصلہ بھی کرے وہی فیصلہ درست ہوگا۔ لیکن اگر وہ جنگ کرنے کا فیصلہ کرے، تو یہ جنگ یقیناً جہادِ فی سبیل اللہ ہوگی

جہادِ فی سبیل اللہ

اور اس میں جان دینا شہادت۔ موجودہ عسکری نظام کے مطابق میدانِ جنگ میں فوجیں ہی جاتی ہیں۔ ہر ایک نہیں جا سکتا۔ لیکن شہری آبادی بھی اس جہاد میں برابر کا حصہ لے سکتی ہے۔ قرآنِ کریم نے مال اور جان دونوں سے جہاد کا حکم دیا ہے۔ اگر ہمارے سپاہی (یا قومی رضاکار) جان سے جہاد کرنے کے لئے نکلتے ہیں تو شہری آبادی کے لئے مال سے جہاد کرنا لازم آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں، فوج کی کامیابی کا انحصار خود شہری آبادی کے (MORALE) پر ہوتا ہے۔ شہری آبادی جس قدر ہمت اور استقلال کا ثبوت دے گی اور جس قدر امن و سکون سے رہے گی، فوج کے لئے

کامیابی حاصل کرنا اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔ ملک کے لئے دشمن کا حملہ اس قدر پریشاں کن نہیں ہوتا جس قدر پریشاں کُن اور مصائب آفریں، شہری آبادی کا انتشار اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے محمد رسول اللہ والذین معہٗ کی جو دو خصوصیات بیان کی ہیں کہ ـــــ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ وَ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ـــــ تو ان کا مظاہرہ زمانہ امن کے مقابلہ میں زمانہ جنگ میں اور بھی نمایاں ہوجاتا ہے۔ فوج اگر اشداء علی الکفار کا مظاہرہ کرتی ہے تو شہری آبادی کو رحماء بینھم کی مظہر ہونا چاہیئے۔ یعنی تمام باہمی اختلافات و نزاعات کو یکسر بالائے طاق رکھ کر، کامل محبت اور یک جہتی سے پرسکون رہنا اور نہایت ہمت اور استقلال سے تمام مشکلات کا مقابلہ کرنا۔ شہری آبادی اس جہاد میں اس انداز سے حصہ لے سکتی ہے۔ انہی کے لئے کہا گیا ہے کہ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۸/۴۶) باہمی جھگڑے مت پیدا کرو۔ ایسا کرو گے تو تم بزدل بن جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ لہٰذا تم استقامت اور ثبات سے رہو۔ یاد رکھو! خدا ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

فوج کے پاس اگر سامانِ حرب و ضرب کی کمی بھی ہو تو ان کی قوتِ ایمانی اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ ان میں کا ایک ایک مجاہد دشمن کے دس دس سپاہیوں پر غالب آسکتا ہے (۸/۶۵) اور اپنے سے دگنی فوج پر تو یہ بہرحال غالب رہتے ہیں (۸/۶۶)۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

مومن کی قوت

یعنی زندگی کے بلند و بالا مقاصد پر یقین نہ رکھنے والے کی قوت اس کے سامان و اسباب تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن ان مقاصد و اقدار پر ایمان رکھنے والے کے پاس ایک اور قوت بھی ہوتی ہے۔ یعنی صداقت پر مر مٹنے کی شدتِ آرزو جسے قوتِ ایمانی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ قوت بے پناہ ہوتی ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہی قوتِ ایمان، غیر محارب (شہری) آبادی کے دل میں وہ کوہ آسا ہمت پیدا کر سکتی ہے جس سے ہر مشکل کا مقابلہ نہایت ثبات و استقامت سے ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ فریضہ جو موجودہ حالات میں ہم (اہلِ پاکستان) پر عائد ہوتا ہے۔ اگر ہم نے اس فریضہ کی ادائیگی میں ذرا

سی بھی کوتاہی کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے بھی قرآن کریم کے الفاظ میں سن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً
وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸/۲۵)

اس تباہی سے بچو کہ جب وہ آجائے تو پھر انہی تک محدود نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظلم اور زیادتی کی ہو۔ اس کے شعلے سارے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے ہیں اور پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

نہ کہ را منزلت باشد نہ مہ را

اور یہ خدا کے اس قانونِ مکافات کی رُو سے ہوتا ہے جس کا تعلق انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ سے ہے اور یہ قانون اپنی گرفت کے لحاظ سے بڑا شدید واقع ہوا ہے

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

یہ ہے برادرانِ عزیز! فطرت کا اٹل اصول۔ اس کی رُو سے زندہ وہی رہ سکتا ہے جو مرنا جانتا ہے۔ اس کے بغیر انسان کا ہر دعویٰ باطل اور ہر اعتقاد جھوٹا ہوتا ہے۔

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی

مجھے یقین ہے کہ وقت آنے پر ہم اس امتحان میں پورے اتریں گے۔ خوش بخت ہیں وہ افراد جنہیں ایسے مواقع میسر آجائیں جن میں جنت انہیں پکار پکار کر بلا رہی ہو اور خدا کی رحمت ان کی طرف ہجوم کرکے آرہی ہو۔

عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان کی آئیڈیالوجی (نظریہ)

قوموں کا مستقبل ان کی اُبھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس قسم کے آج کے نوجوان، اُسی قسم کی کل قوم۔ اگر نوجوان کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو قوم خود بخود صحیح قالب میں ڈھل جائے گی۔ حصولِ پاکستان کے بعد سب سے مقدم کرنے کا کام یہ تھا کہ ہم اپنے بچّوں کی تعلیم اس آئیڈیالوجی کے مطابق کرتے جس کے تحفّظ کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ہم نے اس مقدّس فریضہ سے مجرمانہ تغافل برتا جس نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج اپنی قوم کی بے راہ روی کا اس قدر ماتم کر رہے ہیں۔

پاکستان کی آئیڈیالوجی، قرآنِ حکیم کی تعلیم اور نبئ اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے قرآنی تصور کے سوا اور کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے نوجوانوں کی صحیح تعلیم کا مقصود بھی اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے قلب و دماغ کو اسی سانچے میں ڈھالا جائے اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے، وہ فیصلہ کر سکیں کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ علّامہ اقبالؒ نے اسے نہایت جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ ؎

از کلیدِ دیں درِ دُنیا کشاد

اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد طالب علم اس قابل ہو جائے کہ "دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے"۔ اس مقصد کے لئے تعلیم کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ طالب علم طبیعیات پڑھیں یا عمرانیات، تاریخ پڑھیں یا فلسفہ۔ وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا ــــ غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبے سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے کس طرح ممد و معاون ہو سکتا ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہا قرار دیا ہے ( )۔ یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ،

"فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحئ خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف کیا جائے"۔

اسے بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ قوم کے نوجوان طالب علموں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ

کر دیا جائے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحی کی متعین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کی سیرت میں وہ پختگی اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہو جائے گی جس کے فقدان کا ہم اس وقت اس قدر رونا روتے ہیں۔

اعزاز الدین احمد خان

پاکستان کی سلامتی کا راز

"ہمیں حُبّ الوطنی کا جذبہ نہیں بلکہ جنوں درکار ہے۔ جذبہ تو محض ایک حنوط شدہ لاش کی مانند دل کے تابوت میں منجمد رہ سکتا ہے۔ جنوں، جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت سے خون گرماتا ہے۔ اسی میں پاکستان کی سلامتی اور مستقبل کا راز پوشیدہ ہے۔"　(جناب قدرت اللہ شہاب مرحوم (شہاب نامہ، ص ۱۱۵۸)

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لَا یَحْزَنُوْن کر
خِرد کی گتھیاں سُلجھا چکا میں!
میرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر　(اقبالؒ)

بادشاہت
آمریت
مغربی جمہوریت
غرضیکہ انسانوں کی کسی قسم کی حکومت بھی اسلامی نہیں کہلا سکتی۔
اسلامی حکومت صرف
اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نام ہے
جس کا عملی ذریعہ اس کی کتاب کی حکمرانی ہے　(۳ : ۷۸)

حسین امیر فرہاد

ہیں کواکب کچھ.........

قارئین کرام! عربی زبان کے اکثر الفاظ اپنے مادے کے تحت آتے ہیں. اگر ان میں ایک لفظ کے معنی بدل دیئے جائیں، تو اس کے پیچھے لفظوں کا کارواں جو چلا آرہا ہوتا ہے وہ بھٹک جاتا ہے. مثلاً اگر ہم مجنون کو عاشق تصور کرلیں اور اس پر اڑے رہیں تو دارۃ المجانین (پاگل خانہ) عاشق خانہ کہلائے گا اور جنان جنون (پاگل پن) کو عشق اور عاشقی سمجھنا ہوگا. یا شراب (پینا) کو وہسکی سمجھ لیں تو شربہ (مٹکا، صراحی) کو وہسکی رکھنے کا برتن تسلیم کرنا اور مشرب کو میخانہ اور ہر قسم کی مشروبات کو وہسکی ماننا پڑے گا.

ہمارے ساتھ یہی تکنیک استعمال کی گئی ہے. لفظ کے معنی بدل دیئے گئے. گاڑی کو غلط پٹڑی پر ڈال دیا گیا. اب دن بدن ہم منزل سے دور ہو رہے ہیں. جیسے تلاوۃ کا ترجمہ لہک لہک کر قرآن پڑھنا. اعتکاف کا مسجد میں دس دن تک بیٹھ کر کھانا پینا اور لیٹنا. صلوٰۃ کا نماز. متقی کا نمازی پرہیزگار، انفاق کا خیرات. وقس علیٰ ہذا.

نتیجہ یہ کہ ہم بھٹک گئے ہیں اور جانے کب تک بھٹکتے رہیں گے. میں نے نمونے کے طور پر چند الفاظ پیش کئے، ویسے لاتعداد الفاظ ہیں جن کا حلیہ بگاڑ دیا گیا ہے. ان میں ایک لفظ 'عبد' بھی ہے. عبد دراصل ایک خوشبودار پودے کو کہتے ہیں جو اونٹوں کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے. اس کے کھانے سے اونٹ فربہ ہو جاتے ہیں اور ان کا دودھ بھی زیادہ ہو جاتا ہے. لغات القرآن میں مذکور ہے کہ خاصیت کے اعتبار سے اس پودے کا مزاج گرم ہوتا ہے اس لئے جب اونٹ اسے کھاتے ہیں تو انہیں پیاس لگتی ہے، وہ پانی مانگتے ہیں. اس لئے اس پودے میں تین خصوصیات ہیں.

۱۔ کشش و جاذبیت.

۲۔ ابتداء میں پیاس کی تکلیف لیکن آخرالامر نفع بخشی.

۳۔ فربہی اور دودھ میں فراوانی.

لہٰذا اس کے بنیادی معنوں میں ابتداءً تکلیف لیکن آخرالامر نفع بخشی کے پہلو مضمر ہیں. ابن فارس نے اس کے

بنیادی معنوں میں دونوں باتوں کو شامل کیا ہے (یعنی اس طرح کی نرمی کہ جس سے درحقیقت سختی آجائے) اس
بنیادی مفہوم کے اعتبار سے عبادۃ کے معنی ایسا کام کرنا ہے جو دل کے شوق اور رغبت سے سرانجام دیا جائے.
(کیونکہ عبد پودا اپنی خوشبو کی وجہ سے اپنے اندر خاص کشش رکھتا ہے) اور وہ نتائج کے لحاظ سے نہایت منفعت بخش

ہے.

مشقت اور منفعت کے دونوں پہلوؤں کو ساتھ رکھ کر عبد کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں. عرب ممالک میں ایسے
سائن بورڈ نظر آتے ہیں جب آدمی کچی اور غیر ہموار سڑک کو چھوڑ کر ہموار سڑک کی طرف آتا ہے تو وہاں لکھا ہوتا ہے.
اِمَامَكَ طَرِيقَ الْمُعَبَّدْ. آپ کے آگے محنت سے کوٹی ہوئی ہموار اور کھلی سڑک ہے ـــ اس طرح سے
سڑک کوٹ کوٹ کر ہموار کرنا تاکہ لوگ اس پر آسانی سے چل سکیں. آپ دیکھئے کہ ان کاموں میں ابتداءً کس قدر
محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے لیکن آخرالامر نتیجہ کس قدر منفعت بخش ہوتا ہے. قانون کے مطابق زندگی بسر
کرنے میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے. لہٰذا عبادت کے معنی ہیں انسان اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (سرکش وبیباک
رکھنے کے بجائے) قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرے جس کا نتیجہ منفعتِ عامہ ہوگا. عِبَادُ الشَّمْس
(SUNFLOWER) کو کہتے ہیں. عربی زبان میں اس لفظ کے معنی کہیں بھی پرستش (WORSHIP) کے نہیں.
تَعَبُّدْ کے معنی ہیں جانثار، وفادار (DEVOTE) اور اَسْتَعْبُدْ کے معنی ہیں گردیدہ، دل موہ لینا ـــ
(ENTHRAL). عبادۃ کے معنی ہیں فرمانبرداری، وفاشعاری، اطاعت گزاری (OBEDIENCE). عبد،
خادم، نوکر (SERVANT) کو بھی کہتے ہیں. غلام کو بھی عبد کہتے ہیں (عورت عبدہ). چونکہ عرب کا اپنا رنگ احمر
گندمی ہے. کالے لوگ افریقہ سے لائے جاتے تھے. پھر انہیں فروخت کر دیا جاتا تھا. لہٰذا ہر سیاہ فام (BLACK
NEGRO) کو عبد کہا جاتا ہے. غلام کی نسلیں بھی غلام کہلاتی ہیں. چاہے اسے کسی نے آزاد کر دیا ہو یا اس
کے والی وارثوں کا پتہ نہ ہو، وہ مر کھپ گئے ہوں. حالانکہ انہیں آزاد کہلانا چاہیئے تھا. مگر ایسا نہیں ہے. وہ اپنی
رنگت کی وجہ سے آج بھی عَبِيْد کہلاتے ہیں یعنی غلام. اور ان کی سزا ایک سفید فام عرب سے الگ ہوتی
ہے. یہ (قطر کا) واقعہ ہے ۱۹۶۶ء کا. میرے سیکشن کے سیاہ فام سارجنٹ نجیت کو سفید فام سعودی سپاہی
نے سرکاری ریوالور سے قتل کر دیا. عدالت نے قاتل کو ایک مخصوص رقم مقتول کے بھائی کو ادا کرنے کو کہا. مقتول
کے بھائی نے وہ رقم قبول نہ کی. کہا آپ اسے موت کے بدلے موت کی سزا دیں. عدالت نے کہا ایسا ممکن
نہیں کیونکہ تمہارا بھائی تو مِنَ الْعَبِيْد غلاموں میں سے تھا. کالا تھا.
ایسا واقعہ بھی دیکھا کہ صحرا میں کالے کی لاش نظر آئی. اسے اذیت دے کر قتل کیا گیا تھا. میں نے پہچان لیا.
وہ عبد تھا. اس کے مالک کے پاس مجھے بھیجا گیا. میں نے اس کے شیخ سے کہا. ہمیں آپ کے عبد کی لاش ملی ہے.

سا اسے میں نے مار کر پھینکا تھا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے' جاؤ کمانڈر سے کہہ وہ میرا عبد تھا میں نے مار دیا۔
میں نے کمانڈنٹ کو خبر دی۔ وہ معاملہ عدالت تک لے گیا۔ مگر شیخ کو نہ جرمانہ ہوا نہ جیل کیونکہ مقتول سیاہ فام غلام تھا اور قاتل جابر حاکم تھا۔

بہرحال' اگر عبد غلام ہے اور عبودیت غلامی' تو بھی ۲۷ سال کے عرصے میں' میں نے کسی عبد کو مالک کے سامنے سجدہ ریز نہیں دیکھا۔ اگر کوئی عبد ایسا کرتا بھی تو مالک اسے سزا ضرور دیتا کیونکہ پرستش سے مالک کا کوئی بگڑا کام سنور نہیں سکتا۔

قارئین کرام! اب تک کی تحریر سے آپ کو یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ عَبْدٌ ' تَعْبُدُوا استعبد وعبادۃ وعبودیۃ کے معنی یہی ہیں۔ جانثار' وفادار' گرویدہ' دل موہ لینے والا' فرمانبردار' وفاشعار' اطاعت گزار' نوکر خادم' غلام بندہ' انسان' سیاہ فام وغیرہ۔ آیئے ایک ایک کا تجزیہ کرتے ہیں کہ ان کے فرائض کیا ہیں۔ اس طرح یہ پتہ چل جائے گا کہ ہمارے فرائض کیا ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس سے ہمارے مالک کی منشاء پوری ہوگئی۔ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ٥ (۵۱/۵۶) کے معنی یہی ہیں جو ہم کر رہے ہیں۔

عبد کے پہلے معنی ہیں' جانثار کے۔ اب زید بکر کا جانثار ہے۔ اگر کہیں موقعہ آئے جانثاری کا ایسے موقعہ پر جانثار صاحب یعنی زید میاں بکر کو سجدے کرنا شروع کر دے تو بکر مطمئن ہو جائے گا؟ اُسے خوشی ہوگی؟

عبد کے دوسرے معنی ہیں' وفاداری۔ یوں سمجھ لیجئے کہ زید بکر کا وفادار ہے اور وفاداری کا وعدہ کرتا ہے۔ بکر کے گھر میں آگ لگی ہے جو آہستہ آہستہ اس کمرے کی طرف بڑھ رہی ہے جہاں بکر کا کل اثاثہ اور بچے ہیں۔ وہ خود بھی آگ بجھا رہا ہے اور اپنے وفادار خادم کو بھی بالٹی پکڑا دی کہ آگ بجھائے۔ ایسے موقعہ پر اگر خادم مالک کو سجدے کرنا شروع کر دے تو مالک کے کیا تاثرات ہوں گے۔

گرویدہ' دل موہ لینا اور جانثار میں کوئی فرق نہیں۔ اگلا لفظ ہے فرمانبردار۔

عبد کے تیسرے معنی ہیں' فرمانبردار۔ اگر مالک اپنے فرمانبردار نوکر' خادم یا غلام کو کہے کہ اخبار لے آ۔ فرمانبردار نوکر فوراً سجدہ کر دے۔ مالک کہے چائے لے آ وہ پھر سجدہ کر دے۔ مالک کہے پانی لے آ۔ فرمانبردار غلام حرکت میں آ کر فرمان نہیں بجالاتا البتہ سجدے پہ سجدہ کئے جا رہا ہے۔ ایسے نوکر کی دماغی حالت کے متعلق کیا خیال ہے۔ کیا وہ صحیح دماغ کہلانے کے قابل ہے۔

عبد کے چوتھے معنی ہیں اطاعت گزاری کے۔ یہاں بھی مالک حکم دے کہ چارپائی بچھا' تکیے لا' چلم بھر۔ اطاعت گزار عبد اور تو کچھ نہیں کرتا۔ البتہ دھڑا دھڑ سجدے کرتا ہے۔ ایسے عبد کو اطاعت گزار کہہ سکتے ہیں؟ وہ

تو سراسر نافرمان ہے۔

اب آئیے ذرا اپنے اوپر ایک نظر ڈالیں کہ کہیں ہم بھی ان نافرمانوں میں سے تو نہیں۔ کہیں ہم نے اپنے مالک کے احکامات کے ساتھ اس قسم کا مذاق تو نہیں کیا؟ کہیں ہم نے اپنے مالک کے ارشادات و تعلیمات کے ساتھ بھی کھیل تو نہیں کھیلا؟ کہیں ہم نے اپنے مالک کی ہدایات و فرمودات کے ساتھ بعینہٖ عمل تو نہیں کیا؟ ہمارے لئے اپنے مالک کا حکم ہے جسے ہم روز قرآنِ کریم میں پڑھتے ہیں۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (۴/۲۹)

اے مومنو ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ

(۲/۱۸۸)

اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ نہ رشوت حاکموں کے پاس پہنچاؤ۔

کیا ہم نے اس حکم کی تعمیل کی۔ رشوت خوری، حرام خوری ترک کر دی۔ ناجائز منافع خوری سے توبہ کر لی یا صرف مسجد ول پہ زور دیا ہے۔ یہاں ڈبگری (پشاور) میں ایک ڈاکٹر ہیں۔ فیس چار سو ہے۔ اگر اس میں روپیہ بھی کم ہو تو مریض کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے مگر موڑ کا، قرآن اور مصلے علیحدہ ہے، مطب کا علیحدہ اور گھر کا علیحدہ۔ ماتھے پر سجدے کا وہ گومڑ بنا ہے کہ مٹائے نہ مٹے ــــــ فرمایا: وبالوالدین احسانا (۲/۸۳) اور والدین سے احسان کرو۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اس حکم کی پاسداری کرتے ہیں۔ کتنے ہیں جو والدین کو بوجھ سمجھتے ہیں۔ فرمایا۔ ولا تکتموا الشہادۃ (۲/۲۸۳) گواہی مت چھپانا ــــ گواہی چھپانے والا ایسا ہے جیسے وہ خود جرم میں شریک ہو۔ حکم تو یہاں تک ہے۔ ولا تلبسوا الحق بالباطل و تکتموا الحق وانتم تعلمون (۲/۴۲) کبھی سچ کو جھوٹ کا لبادہ مت اوڑھاؤ اور نہ ہی حق بات کو چھپاؤ۔

ہمارے ہاں آنکھوں کے سامنے جرم ہوتے ہیں۔ نہ ہی روکنے کی کوشش کرتے ہیں نہ ہی گواہی دیتے ہیں حالانکہ الشہادۃ للہ، گواہی کسی زید و بکر کیلئے نہیں صرف اللہ کے لئے ہے۔ ایک دن ایک نمازی پرہیزگار گاؤں کے فیصلے کرنے والے، زکوٰۃ کمیٹی کے چیئرمین، شوقیہ اذان دینے والے بزرگ میرے پاس آئے اور کہا۔ میں اپنے آپ سے آپ کو بہتر سمجھتا ہوں اس لئے مشورہ لینے آیا ہوں کہ کل جو میرے لڑکے کی دکان میں قتل ہوا۔ قصائی نے فلاں کو قتل کر دیا۔ اس سلسلے میں میرے بیٹے کو گواہی کے لئے طلب کیا گیا ہے۔ یہ بتائیے کہ وہ کیا گواہی دے۔

میں نے کہا۔ ذرہ نوازی ہے جو آپ نے اس قابل سمجھا۔ بیٹے کو کہو جو کچھ دیکھا ہے وہ بیان کر دے۔ کہا اس طرح تو قصائیوں سے دشمنی ہو جائے گی۔

میں نے کہا دوسری جانب خدا سے دشمنی ہونے کا خطرہ ہے۔ خیر آپ یوں کریں کہ ترازو کے ایک پلڑے میں اللہ کو بٹھا دیں دوسرے میں قصائی کو، جو بھاری اور طاقت ور نظر آئے اس کا ساتھ دیں۔

دوسرے دن اس کے بیٹے نے بیان دیا کہ وہاں بہت لوگ تھے، گولی چلی، دیکھا تو فلاں مرا پڑا تھا پتہ نہیں کس نے گولی چلائی ـــــ یعنی بڑے میاں نے اللہ پر قصائی کو فوقیت دی۔ خدا کو چھوٹا اور قصائی کو بڑا تسلیم کیا۔ مگر غضب یہ کیا کہ دوسرے دن کھڑا اذان دے رہا تھا۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے، اللہ بڑا ہے) جب چبوترے سے اُتر آیا تو میں نے کہا۔ قبلہ الفاظ بدل دیجئے۔ کہیئے القصاب اکبر، قصاب اکبر۔ سر جھکا کر کہا۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔

> ہمارے مالک کا حکم ہے سرقہ مت کرو، غیبت مت کرو، تہمت تراشی سے دور رہو، خمر اور میسرہ سے دور رہو، شریف زادیوں کو تنگ نہ کرو، ان سے چھیڑ چھاڑ کرنا، ان کے خلاف افواہیں پھیلانا سنگین ترین جرم ہے جس کی سزا حقوقِ شہریت سے محرومی سے لیکر قتل تک ہو سکتی ہے (۳۳/۵۹ ـ ۶۰)۔

ہم جنسی اور فواحشات سے دُور رہو، امانات میں خیانت نہ کرو، لغو اور بے ہودہ گفتگو سے اجتناب کرو، قرعہ اندازی سے کسی پر ظلم نہ کرو، افواہیں نہ پھیلاؤ، بات تحقیق تک پہنچاؤ، کھانے پینے کی حرام چیزوں سے پرہیز کرو، بدعہدی مت کرو، ہم میں سے کتنے ہیں جو مالک کے ان احکامات کو مانتے ہیں۔ البتہ سجدوں میں کوتاہی نہیں کرتے۔ تو عبد کا فریضہ تو ہے فرمانبرداری، وفاشعاری، اطاعت گذاری، محکومیت، نہ کہ پرستش۔ پھر ہمارا کیا ہوگا۔ کیونکہ ہم تو باوضو ہو کر سجدہ کرنا جانتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں یہ ذکر بھی آیا ہے۔ مثلاً قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا (۲۶/۷۱)۔ انہوں نے کہا ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں ـــــ یہ بُت درحقیقت مظاہر ہوتے تھے ان معبودوں کے جو ان لوگوں کے ذہن میں مجرّد شکل (ABSTRACT FORM) میں موجود ہوتے تھے جن کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ وہ انہیں نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ ان کے سامنے طمع یا خوف سے جھکتے تھے کہ کہیں نقصان نہ پہنچا دے۔ یہی بنیاد کسی کی محکومی کے لئے بھی ہوتی ہے۔ یعنی قرآنِ کریم میں اگر کہیں عبودیت کا لفظ آجائے اور اس کے معنی پرستش کی طرف اشارہ کرتے ہوں تو عمق میں اس کے معنی محکومیت کے ہوتے ہیں جس میں ذہنی اور جسمانی محکومیت دونوں آجاتی ہیں۔

اب جیسے کہ عبد الطاغوت (۵/۶۰) ہے۔ یعنی شیطان کی پرستش کرنے والا۔ تو شیطان کی پرستش کہیں بھی نہیں ہوتی۔ البتہ اطاعت اور فرمانبرداری ہر جگہ ہوتی ہے۔ پرستش اور اطاعت کے فرق کو اللہ تعالیٰ نے

بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝

(۴۰/۶۶)

اے محمدؐ! اُن سے کہہ دو کہ مجھے اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو میں ان کی پرستش کروں اور میں ان کی پرستش کیونکر کروں جبکہ میرے پاس میرے پروردگار کی طرف سے کھلی دلیلیں آچکی ہیں اور مجھ کو حکم ہوا ہے کہ پروردگار عالم ہی کا تابع فرمان رہوں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ

ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں (۱۹/۴۲) ـــــ مگر اسی سورت کی آیت ۴۴ میں وضاحت کر دی گئی۔ فرمایا۔ "ابا شیطان کی پرستش نہ کیجئے بیشک شیطان خدا کا نافرمان ہے۔"

آیت ۴۲ میں ذکر ہے کہ وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ۴۴ میں ذکر ہے کہ وہ شیطان کی پوجا کرتے تھے۔ معاملہ کیا ہے؟ معاملہ یہی ہے کہ بتوں کی پوجا ہو یا غیر اللہ کی۔ یہ دراصل شیطان کی اطاعت اور فرماں برداری ہی ہوتی ہے۔

سورۂ یٰسین میں ارشاد ہوا۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ

(۳۶/۶۰)

اے آدم کی اولاد ہم نے تم سے کہہ نہیں دیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔

یہاں بھی شیطان کی عبادت سے شیطان کی محکومی اور فرمانبرداری مراد ہے۔ جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا اس سے مفہوم یا تو انسان کے خود اپنے جذبات کی اطاعت ہوگی یا دوسرے انسانوں کے احکام کی اطاعت۔ ان میں مستبد حکمرانوں کی محکومیت اور مذہبی پیشواؤں کی عقیدت مندانہ اطاعت بھی شامل ہوگی۔

اس کے مقابلے میں خدا کی اطاعت سے مراد ہوگی اس کے قوانین کی اطاعت، خدا کی محکومیت۔ جہاں بتوں، دیویوں اور دیوتاؤں کا ذکر ہوگا وہاں ان کی توہم پرستانہ پرستش مفہوم ہوگا۔ ان کی پرستش کا جذبہ محرکہ

بھی وہی ہوتا ہے جو بادشاہوں کے سامنے جھکنے کا ہوتا ہے۔

عبادت اور پرستش کا فرق یہاں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ (۴۱/۳۷)

تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو بلکہ خدا ہی کو سجدہ کرو جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے اگر تم کو اس کی عبادت منظور ہے۔

اگر سجدہ (پرستش۔ پوجا پاٹ) اور عبادت ایک ہوتے تو سجدے کے بعد عبادت کے لفظ کی ضرورت نہ تھی، مگر ایسا نہیں ہے۔ سجدہ پرستش کے زمرے میں آتا ہے جبکہ عبادت سے مراد ہے فرمانبرداری، وفاشعاری، اطاعت گزاری، محکومیت وغیرہ۔

دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوْا .... (۲۲/۷۷)۔

اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اب اگر عبادت سے مراد پرستش ہوتی تو وہ رکوع اور سجدے میں موجود تھی۔ عبادت کا لفظ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر رکوع وسجدہ چیزِ دیگر است اور عبادت چیزِ دیگر۔

ہم پرستش پوجا پاٹ تو کرتے ہیں اور اتنی کرتے ہیں کہ ماتھے پر نشان پڑ جاتا ہے مگر اللہ کی عبادت (فرمانبرداری وفاداری، اطاعت شعاری، محکومی) نہیں کرتے۔ اور ہم خوش ہیں مطمئن ہیں کہ حق بندگی ادا ہو گیا، مقصدِ حیات پورا ہو گیا، ہم انعامِ خداوندی کے حقدار ہو گئے، جنت ہماری ملکیت بن گئی۔ مگر یہ معاملہ وہی ہے شیطان نے رب سے کہا۔ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ○ (۱۵/۳۹) کہا پروردگار جیسا تو نے مجھے راستے سے الگ کر دیا میں بھی زمین میں لوگوں کے لئے غلط کام مزین بنا دوں گا۔

لاریب کہ یہ وہی ہے کہ کسی کو مسجدوں میں جنت کی بشارت دیتا ہے۔ کوئی داڑھی رکھ کر اللہ کی اور رسولؐ کی خوشنودی کا دعویدار ہے۔ کوئی ٹخنے سے ایک بالشت پائجامہ اوپر رکھ کر کسی کے لئے تبلیغ کو جنت کی کنجی بنا رکھا ہے۔ کسی کو تسبیح، درود اور وظیفے مراقبے میں مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ

جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۳).

کیا تم سمجھتے ہو کہ بے آزمائش جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی خدا نے تم میں جہاد کرنے والوں کو تو اچھی طرح معلوم کیا ہی نہیں (اور یہ بھی مقصود ہے کہ) وہ ثابت قدم رہنے والوں کو معلوم کرے۔ اور یہ جنت تو جان و مال بیچ کر میدانِ جنگ میں ہاتھ آتی ہے (۹/۸۸).

چلّہ کشی (جہادِ نفس) سے نہیں۔ چلّہ کشی اور جہادِ نفس کا دین میں ذکر ہی نہیں۔ یہ وہی اعمال ہیں جو ہم سے پہلوں نے کئے تھے اور تباہ و برباد ہو گئے۔ فرمایا۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (۳/۱۳۷)

تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گزر چکے ہیں۔ تم اس میں سیر کر کے دیکھ لو کہ مکذبین کا انجام کیا ہوا۔

مکذبین کوئی اور نہیں ہم ہی ہیں۔ فرمایا۔ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ۔ کیا تم نے دیکھا دین کی تکذیب کرنے والوں کو۔ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ۔ یہ وہی بدبخت ہیں جو معاشرے میں تنہا رہنے والوں کی مدد نہیں کرتے اور بھوکے کو کھانا نہیں کھلاتے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ۔ ایسے نمازیوں کے لئے تباہی ہے۔ قارئین کرام! الحاصل یہ کہ مکذبین جنت میں نہیں جائیں گے اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ مکذبین کون ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی خوش فہمی ہو تو اسے دل سے نکال دینا چاہیئے۔

کتاب التقدیر

تقدیر کا مسئلہ دنیا کا مشکل ترین مسئلہ ہے. وہ کون سا دماغ ہے جس میں اس قسم کے سوالات نہیں اُبھرتے کہ

کیا انسان کی قسمت پہلے سے لکھی ہوتی ہے ؟

کیا سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے ؟

کیا رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے کہ وہ جسے چاہے امیر بنا دے اور جسے چاہے کنگال کردے ؟

کیا غریبوں کی قسمت ہی ایسی ہے کہ وہ ساری عمر دھکے کھاتے رہیں ؟ کیا خدا کو ایسا ہی منظور ہے ؟

کیا عزت اور ذلت خدا کی طرف سے ملتی ہے ؟

کیا یہ ٹھیک ہے کہ ــــ موت کا ایک دن مقرر ہے یا انسان کی عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے ؟

بعض بچے پیدائشی اندھے، اپاہج، لولے، لنگڑے ہوتے ہیں. بھلا ایسا کیوں ہوتا ہے ؟

کیا یہ ٹھیک ہے کہ وہ جسے چاہے لڑکے دے، جسے چاہے لڑکیاں دے ؟

اگر خدا کے ہاں عدل ہے تو وہ ظالموں کو ظلم سے کیوں نہیں روکتا ؟

کیا دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے. اگر نہیں بدلتی تو ہم دعا کیوں کرتے ہیں ؟

یہ اور اسی قسم کے دیگر سوالات کا تعلق مسئلہ تقدیر سے ہے جس نے انسانی ذہن کو طلسمِ پیچ وتاب بنائے رکھا ہے. یہی وہ مسئلہ تھا جسے صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے کارل مارکس نے کہہ دیا کہ " مذہب عوام کے لئے افیون ہے."

پرویزؒ صاحب نے دنیا کے اس مشکل ترین مسئلہ کو اپنی تصنیف

کتاب التقدیر

میں، قرآن کریم کی روشنی میں بڑی عمدگی سے حل کر دیا ہے ــــ صرف اعلیٰ ایڈیشن میں دستیاب ہے۔

مینیجر ــ طلوعِ اسلام ٹرسٹ

محمد لطیف چوہدری

ذیابیطس کا علاج

(اَکْلُوْا وَشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا)

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انسانی جسم اپنی تمام ضروریات روزمرّہ خوراک سے حاصل کرتا ہے. ضروریات کا تعیّن کرنے اور ضرورت سے زائد مواد جسم سے از خود خارج کرنے کا خود کار نظام جسم کے اندر موجود ہے۔

جسم کو رواں دواں رکھنے کے لئے خون میں جن کیمیائی عناصر کی ہمہ وقت موجودگی لازمی سمجھی جاتی ہے ان میں گلوکوز یعنی "شکر" سرِفہرست ہے. بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس طرح پٹرول گاڑی کو قوت فراہم کرتا ہے اسی طرح شکر جسم کو توانائی فراہم کرتی ہے. شکر خوراک میں شامل نشاستہ دار اشیاء سے حاصل ہوتی ہے. وہ اس طرح کہ جسم کا نظامِ ہضم نشاستہ دار اشیاء کو آنتوں میں پہنچنے سے پہلے ہی شکر میں تبدیل کر دیتا ہے. آنتوں سے خون میں جذب ہو کر شکر سیدھی جگر میں پہنچ جاتی ہے. جگر اسے گلوکوجن میں تبدیل کرکے اپنے اندر ذخیرہ کر لیتا ہے. گلوکوجن کا کچھ حصہ پٹھے بھی ذخیرہ کرتے ہیں اور اس طرح خوراک سے شکر کی جس قدر مقدار حاصل ہوتی ہے وہ براہِ راست خون میں گردش کرنے کی بجائے قدرت کے فراہم کردہ ان گوداموں میں جمع ہو جاتی ہے اور یہاں سے دوبارہ شکر میں تبدیل ہو کر حسبِ ضرورت خون میں شامل ہوتی رہتی ہے. جسم میں شکر کی کھپت کا انحصار جسم سے لئے جانے والے کام کی نوعیت ہے. ایک صحت مند آدمی کے خون میں شکر کی فراہمی چونکہ گلوکوجن کے ذخائر سے ایک خود کار نظام کے تحت ہوتی ہے اس لئے خوراک کی کمی بیشی خون میں شکر کے لیول پر اثر انداز نہیں ہوتی لیکن جب یہ نظام کسی وجہ سے درہم برہم ہو جاتا ہے تو غذا سے حاصل ہونے والی شکر جسم کے اندر گوداموں میں محفوظ ہونے کی بجائے سیدھی خون میں پہنچ جاتی ہے. آپ نشاستہ دار غذا زیادہ لیں گے تو خون میں شکر کا لیول بلند ہو کر فساد پیدا کرے گا، کم لیں گے تو پٹھوں میں نقاہت محسوس ہوگی. ڈاکٹر حضرات اس کی وجہ جسم میں انسولین کی کمی یا عدم موجودگی بتاتے ہیں اور اسے ذیابیطس کا نام دیتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ اس بیماری کے لاحق ہو جانے سے ہوا کیا ہے؟ آپ کا جسم شکر بنا بھی رہا ہے اور حسبِ ضرورت

اسے استعمال میں بھی لارہا ہے۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ جسم میں شکر ذخیرہ کرنے کا عمل ماند پڑ چکا ہے یا ختم ہو گیا ہے۔ گویا خون میں شکر میں لیول برقرار رکھنے کا جو عمل جسم کا خود کار نظام کرتا تھا وہ اب آپ کو خود کرنا ہوگا اور یہ ذرا بھی مشکل نہیں۔ خون میں شکر کی مقدار اگر زیادہ ہے یا شکر کی کچھ مقدار پیشاب میں خارج ہو رہی ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ اپنی روزمرّہ خوراک میں اپنے جسم کو اس کی ضرورت سے زیادہ شکر فراہم کر رہے ہیں۔ شکر بدن کے اندر ذخیرہ کرنے کا عمل چونکہ بیماری کا شکار ہو چکا ہے اس لئے آپ کی نگلی ہوئی فالتو شکر پیشاب کے ساتھ جسم سے باہر آرہی ہے۔ اب یہ کونسی عقلمندی ہے کہ خوش خوراکی کے زعم میں ضرورت سے زیادہ شکر جسم میں انڈیل کر گردوں کو اسے خارج کرنے پر لگا دیا جائے یا فالتو شکر اندر ہی اندر جلانے کے لئے ادویات کا سہارا لیا جائے۔ مرض اگر لاحق ہو ہی گیا ہے تو بھی قرآنِ حکیم میں دیئے گئے صحت کے عالمگیر اصول پر عمل کرکے اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اور وہ اصول ہے

كُلُوا وَ اشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (۳۱/۷)

کھاؤ، پیو لیکن کھانے میں جس چیز کی جتنی ضرورت ہے اس سے زیادہ نہ کھاؤ۔ شکر کی ضرورت چونکہ ہر جسم کی مختلف ہوگی اس لئے سوال اب اتنا ہی رہ گیا کہ کسی ایک جسم کی ضرورت کا تعین کس طرح کیا جائے۔ بات یہ بھی آسان ہے۔ یہ جاننے کے لئے کہ کوئی ٹنکی کتنا پٹرول لے سکتی ہے۔ آپ اس میں پٹرول ڈالتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کی مقدار بڑھاتے جاتے ہیں۔ جونہی پٹرول ٹنکی سے باہر گرتا ہے آپ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ٹنکی اس سے زیادہ مقدار میں پٹرول نہیں لے سکتی۔ اس طریق سے خوراک کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ کسی سہانی صبح معمول کی دوسری اشیاء کے ساتھ تھوڑی مقدار میں نشاستہ دار اشیاء لیں اور تین گھنٹے بعد ٹسٹ کریں کہ پیشاب میں شکر تو نہیں آرہی۔ اب نشاستہ دار اشیاء کی مقدار بڑھاتے جائیں۔ جہاں پیشاب میں شکر کا اخراج دکھائی دے وہاں رُک جائیں۔ یہ آپ کی خوراک کی آخری حد ہے۔ اپنی روزمرّہ کی خوراک اس سے قدرے کم پر محدود کرلیں اور اس پر سختی سے عمل کریں۔ فالتو شکر جسم میں محفوظ رکھنے کا عمل چونکہ مفلوج ہو چکا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ آپ کی کھائی ہوئی "محدود غذا" زیادہ دیر تک آپ کو توانا نہ رکھ سکے، اور آپ پر "کم شکری" کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو جائیں۔ اس مشکل پر آپ کھانوں میں وقفہ کم کرکے قابو پا سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنے جسم کی ضروریات کے مطابق خون میں شکر کا لیول آپ نے خود غذا کے ذریعے کنٹرول کرنا ہے۔ کم کھایا۔ کمزوری محسوس ہوئی تو پھر کھا لیا۔ ذیابیطس کا یہی مؤثر علاج ہے۔ آزما کر دیکھئے۔

علی محمد چدھڑ

نغمۂ جاں فزا

دس مارچ کے روزنامہ 'جنگ' میں حکومت کی طرف سے یہ خبر بلکہ خوش خبری پڑھنے کو ملی کہ "اس سال کے آخر تک تمام قوانین اسلامی بنا دیئے جائیں گے۔" میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا کام اور کیا ہو سکتا ہے کہ جن مقاصد کے لئے ہم نے یہ مملکت حاصل کی تھی وہ حاصل ہو جائیں۔ لہٰذا یہ چند گزارشات نظریاتی کونسل کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

حضورؐ کا کوئی فعل یا قول جو ان کی طرف منسوب کیا جائے خلافِ قرآن نہیں ہو سکتا اور یہ بھی کہ اپنی ساری حیات مبارکہ کے دوران آپؐ نے جو کچھ کیا اور کہا قرآن کے عین مطابق ہے۔ حضورؐ نے سب سے پہلے خود قرآن کا اتباع کیا پھر اپنی جماعت کو حکم دیا کہ جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ دوسرے کارسازوں کا اتباع مت کرو۔ ایک دوسری جگہ حضورؐ کو مخاطب کرکے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

"اے نبیؐ! جب یہ لوگ اپنے اختلافی امور کے فیصلہ کے لئے آپؐ کے پاس آئیں تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کیا کریں۔" (۵/۴۸)

ایک طرف رسولِ کریمؐ کو خدا کا یہ حکم ہے اور دوسری طرف عام لوگوں کو تاکیداً انتباہ کے لہجے میں کہا جا رہا ہے کہ اپنے تمام اختلافی امور میں پیغمبرِ اسلام کو اپنا ثالث بنائیں اور پھر ان کے فیصلے دل و جان سے قبول کریں۔ گویا ہر صورت میں اولیت کتاب اللہ ہی کو حاصل ہے۔ اسے آپ کتاب و سنّت کا نام دے دیں یا ضابطۂ خداوندی کا، بات ایک ہی ہے۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ آخر دم تک یہی کہتے رہے کہ قوانین سازی کا مدار کتاب اللہ پر ہے اور اتباعِ سنت ہے حضورؐ کی سیرت اور اسوہ حسنہ کی پیروی کا۔ حضورؐ نے قرآن کی اتباع فرمائی۔ لہٰذا قرآن کی اتباع ہی رسول اللہ کی سنت ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ہمارے دین کی اساس اور آئین کا ماخذ خدا کی کتاب قرار پائی جس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن ہی کو حق و باطل، جائز ناجائز، صحیح اور غلط میں امتیاز کا اختیار حاصل ہے (الفرقان کے یہی معنی ہیں)۔ ہماری تاریخ ہو کہ سیرت، فقہ ہو یا روایات، سب کو قرآن کی روشنی میں پرکھا جائے۔ جو اس کے مطابق ہو

قبول کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو مسترد کر دیا جائے۔

آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ دو قومی نظریہ نے تحریکِ پاکستان کو جنم دیا اور تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں خدا نے اتنا بڑا ملک دے دیا جس کے حصول کا مقصد سیکولرازم یا تھیاکریسی رائج کرنا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ یہاں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی قائم کرنا تھا جس کا خاکہ قائداعظمؒ نے ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے طلباء کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ :-

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی' نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے لفظوں میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

ایک اخباری بیان سے ظاہر ہے کہ کونسل اسلامی قانون سازی کے سلسلہ میں مختلف مکاتبِ فکر سے ایک متفقہ لائحہ عمل حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ ایک دانشمندانہ قدم اور پسندیدہ بات ہے۔ دراصل فرقہ واریت جسے ہم نے مکاتبِ فکر کا نام دے رکھا ہے اتنا خطرناک مرض ہے کہ اس سے رسول اللہ سے بھی ہمارا کوئی واسطہ نہیں رہتا (۶/۱۶۰)۔ بہرحال اس مشکل گھاٹی کو بھی ہم ہی نے سر کرنا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم ایسے فکری اختلافات قرآن کے ذریعہ دور کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

"تم میں مختلف امور میں باہمی اختلاف ہوگا۔ ان اختلافات کے مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے قانون (قرآن) کی رُو سے کیا جائے۔" (۴۲/۱۰)

البتہ یہ تسلیم ہے کہ بہ حالاتِ موجودہ مذہبی فرقہ بندی کے شرک کو بہ یک جنبشِ قلم نہیں مٹایا جا سکتا۔ لیکن اگر

(۱) قرآن کی اساس پر ملک کا قانون مرتب کیا جاتے تو اس کا اطلاق مملکت کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں طور پر ہوگا۔ اس سے فرقہ بندی کی گرہیں خود بخود ڈھیلی پڑ جائیں گی۔

(۲) مختلف مکاتبِ فکر کے مذہبی درس و تدریس کے مراکز ختم کر دیئے جائیں (فرقہ واریت کے یہی ذرائع ہیں)۔

(۳) تعلیم کا انتظام اس طرح کیا جاتے کہ مذہبی اور سیکولر (دینی اور دنیاوی) تعلیم کی موجودہ غیر اسلامی ثنویت ختم کر کے سب بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے ان میں تمام دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن کے بلند اقدار کا شعور بھی پیدا ہوتا چلا جائے۔ اس سے بھی بتدریج ان کے دل و دماغ سے فرقہ واریت کی لکیریں

مٹ سکتی ہیں۔

علامہ اقبالؒ کہا کرتے تھے "اسلامی ضابطۂ قوانین وہی مرتب کر سکے گا جو حضرت عمر فاروقؓ کی روح لئے ہوئے یہ کہے کہ حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے)۔ ان کا ایک دوسرا یہ قول بھی مشہور ہے کہ "نفسِ اسلام قرآن مجید میں بہ کمال و تمام آچکا لہذا خداوند تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں"۔ دراصل قرآن کی جامعیت قرآن کی رُو سے ہی ثابت ہے۔ مثلاً کہا گیا کہ وہ بنی نوع انسان کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ لاریب، غیر متبدل اور محفوظ ہے۔ تمام اقوامِ عالم کے لئے آئینِ حیات اور قولِ فیصل ہے۔ کتابِ بابرکت اور مبارک نصیحت ہے۔ بے مثل، آسان اور مفصل ہے۔ ہدایت و رحمت اور دل کی بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ جامع، واضح اور اٹل حقیقت ہے۔ نور ہے۔ حق و باطل، جائز و ناجائز اور حرام حلال کے درمیان فرقِ حمید (امتیاز کر دینے والا) ہے۔

قرآن کی یہ تمام خصوصیات ایسی ہیں جو خود خدا نے بیان کی ہیں۔ سو ان میں کسی مبالغہ یا ابہام کا کوئی امکان نہیں۔ ہماری انتہائی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے باوجود ہم نے اس نسخۂ کیمیا کے متعلق طرح طرح کے مفروضے مشہور کر رکھے ہیں۔ مثلاً اس کا سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ یہ ایک خاموش کتاب ہے۔ احادیث کے بغیر مفہوم متعین نہیں ہوتا۔ تشریح اور تعبیر میں اختلاف ہے۔ شانِ نزول کے بغیر بات واضح نہیں ہوتی۔ دینی ضروریات کے تقاضوں کے لئے (معاذ اللہ) اکیلا قرآن کافی نہیں ہے۔ الفاظ کے معنی مختلف اور متضاد ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ خود قرآن ان تمام اعتراضات کی واضح الفاظ میں تردید کرتا ہے۔ حوالہ کے لئے مندرجہ ذیل آیات کا اندراج مناسب ہوگا۔

۱۔ کیا قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کی بجائے کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے۔ (۴/۸۲)۔

۲۔ ان سے کہو کہ کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ خدا نے میری وساطت سے تمہاری طرف اس قسم کا ضابطۂ زندگی بھیجا ہے۔ (۲۹/۵۱)۔

۳۔ ہم نے اس قرآن کو صاف اور غیر مبہم زبان (عربی) میں نازل کیا ہے۔ اس میں کسی قسم کا پیچ و خم نہیں۔ ابہام اور ایہام نہیں تاکہ یہ لوگ (اسے سمجھ کر) زندگی کے خطرات سے بچ نکلیں (۳۹/۲۸)۔

۴۔ ہم قرآن کے مختلف امور کو لوٹا لوٹا کر بیان کرتے ہیں۔ ان کے متنوع گوشے بار بار سامنے لاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اکثر لوگ (بلا سوچے سمجھے) انکار کئے چلے جاتے ہیں (۱۷/۸۹ ؛ ۱۷/۴۱)۔

۵۔ اور اُتاری ہم نے تیری طرف کتاب جو تمام امور کو ابھار اور نکھار کر پیش کر دیتی ہے اور ہدایت و رحمت اور خوش خبری ہے حکمبرداروں کے لئے (۱۶/۸۹)۔

بات تو صاف ہوگئی۔ البتہ ایک نفسیاتی اُلجھن یہ رہ جاتی ہے کہ قرآن کے متعلق عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ خود اپنی تشریح یا تعبیر نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے ہمیں خارج از قرآن دیگر ذرائع کی ضرورت پڑتی ہے۔ چہ جائیکہ ایسا تصور قرآن کی عظمت کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔ دیکھئے، سوچنے اور سمجھنے والی بات یہ ہے کہ ایسا خیال بلکہ عقیدہ درست بھی ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اے نوعِ انسان! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلائل آگئے۔ یعنی اس نے تمہاری طرف ایک ضابطۂ ہدایت بھیج دیا ہے جو خود روشن ہے اور ہر چیز کو روشن کرتا ہے۔" (۴/۱۷۵)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

"تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نُور (روشنی) آگیا۔ یعنی ایک کھُلا ہوا واضح ضابطۂ قوانین۔" (۵/۱۵)۔

اس آیت میں قرآن کو نُور اور کتابٌ مبین کہا گیا ہے۔ اس سے پہلی آیت (۴/۱۷۵) میں اسے نورٌ مبین کہا ہے۔ نور یا روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے تعارف اور نمود کے لئے کسی دوسری روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ روشن چراغ کو دوسرے دیئے کی روشنی سے تلاش نہیں کیا جاتا۔ اس کی اپنی روشنی دیکھنے والے کو خود بخود اپنی طرف لے آتی ہے۔ نیز وہ ہر شئے کا صحیح صحیح مقام متعین کر دیتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ وہ کیا ہے۔ یہی کیفیت قرآنِ کریم کی ہے۔

میں جو کچھ یہاں پیش کر رہا ہوں اس سے میرا مقصد یاد دہانی ہے تاکہ اسلامی قوانین کے اہم ترین کام میں ان تمام حقائق کو ملحوظ رکھا جائے۔ دیکھیں دین اور مذہب، میں سے کس کا انتخاب کرتے ہیں۔ دین سے مراد ہے صدرِ اوّل کا اسلام اور دورِ آمریت کے مختلف فقہی مسالک کو مذہب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انسان فانی ہے اور اقتدار خدا کی امانت۔ لیکن حق اور سچ کے فیصلے ہمیشہ پائیدار اور انقلابی ہوتے ہیں۔ اس وقت ہمارا کوئی غلط فیصلہ ہمیں صدیوں پیچھے دھکیل سکتا ہے۔ خدا نے حضورؐ کو بھی کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرنے کا حکم دیا تھا اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اسلام میں حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے (۱۲/۴۰) اور وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا (۱۸/۲۶)۔ خواہ وہ نبیؐ ہی کیوں نہ ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے:

"کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ـــــ خواہ اسے ضابطۂ قوانین یا اقتدارِ حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ لوگوں سے کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کی نہیں، میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم سب اس کتاب کی اطاعت کرو جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و فکر سے تم اس کے معنی کی تہہ تک پہنچے ہو۔ ربّانی

بن جاؤ. یعنی خدا کے محکوم" (۳/۷۹).

قرآنی مملکت یہ تو کر سکتی ہے کہ معاشرہ کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر قرآنی احکام بتدریج نافذ کرے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وحی اور روایات کے مرکب کا نام اسلامی قوانین رکھ لے (خدا کے حقِ حکومت میں شرکت کے یہی معنی ہیں)۔

آجکل جو لوگ اسلام اور حضورؐ کی سنت کے 'شیدائی' کہلاتے ہیں ان کے سامنے اسلام کا کوئی متعین مفہوم نہیں. سوائے اس کے کہ اسلام نام ہے اتباعِ سلف کا. جہاں تک 'سنت' کی اصطلاح کا تعلق ہے' مروجہ اسلام اس کا کوئی واضح 'یقینی اور متفقہ تصور نہیں دے سکا. بہرحال جو کچھ بھی ہے اس میں ان عناصر کی اپنی مصلحتیں ہیں قرآن بنی نوع انسان کے لئے کیا چاہتا ہے اور اس کا نفاذ موجودہ دور کا کیوں تقاضا ہے. انہیں اس سے کوئی غرض نہیں. وہ لوگ صرف یہ چاہتے ہیں کہ جن اسلاف کو انہوں نے اربابِ من دُون اللہ قرار دے رکھا ہے ان کی معبودیت میں فرق نہ آئے اور یہ بھی اس لئے کہ ان کی معبودیت میں ان کی اپنی بزرگی کا راز پوشیدہ ہے. یہ بڑی عجیب کیفیت ہے کہ ایک طرف تو محراب و منبر سے دن رات زبانی کلامی قرآن کی عظمت اور اہمیت بیان کی جاتی ہے' دوسری طرف کتاب اللہ کے حقیقی نفاذ سے ہر کوئی خالف ہے. اس سے انکار ممکن نہیں کہ اکثر معاملات میں قرآن پر اپنے خود ساختہ اور وضعی قوانین (فقہ و روایات) کو ترجیح دی جاتی ہے. لیکن دعویٰ پھر بھی خدائی قانون کی عملداری کا کیا جاتا ہے. چنانچہ ارشاد ہے کہ

"حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا اور سمجھا ہی نہیں کہ اس کا مقام کیا ہے." (۲۲/۷۵ ؛ ۶/۹۲ ؛ ۳۹/۶۷)

پاکستان ایک ایسی مملکت ہے جس کی بنیاد ایک خاص نظریۂ حیات پر رکھی گئی تھی. اس سے نظریۂ پاکستان کی اصطلاح وجود میں آئی. یعنی ایسی مملکت جو کسی اکثریت یا اس کے ذاتی خیالات یا مقاصد کے مطابق متشکل نہیں ہوئی بلکہ خالص قرآنی اقدار کے فروغ اور نفاذ کے لئے وجود میں لائی گئی تھی. لیکن پچھلے سینتالیس سال سے اس پر ایسی استحصالی قوتیں (سرمایہ داری' ملوکیت' مذہبی پیشوائیت) مسلط ہیں جو سراسر قرآنی منشا کے خلاف ہیں. اس وقت پہلا کرتا دھرتا طبقہ سیاستدانوں کا ہے جو زیادہ تر سرمایہ دار' کارخانہ دار اور جاگیردار ہیں. وہ مصلحتاً خلفائے راشدین کے اسلام سے خائف ہیں اور مذہبی عناصر کے تعاون سے ایسے فقہی مذہب کے متمنی ہیں جو بنی امیہ اور عباسیہ دور کی یادگار ہے. وہ اگر حضرت عمر فاروقؓ کی مثالیں پیش کرتے ہیں تو ان کی سیرت و کردار کو اپنانے کے لئے نہیں بلکہ ان کا نام اپنے اقتدار اور اعتماد کے لئے ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں. دوسرا طبقہ مذہبی جماعتوں کا ہے جن کا وجود ہی فقہی مذاہب سے قائم ہے. یہ لوگ آمروں اور سرمایہ داروں

ناحمایت کے عوض اپنے اپنے مسلک کے پرسنل لاز کا اختیار حاصل کر لیتے ہیں اور یوں اس اتحادِ ثلاثہ سے مذہب کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔

ہمارے مذہبی راہ نماؤں کا معیارِ اسلام یہ ہے کہ وہ قرونِ اولیٰ کے نظام سے خوفزدہ ہیں۔ دورِ ملوکیت ان کا پسندیدہ زمانہ ہے۔ جنرل ضیاء الحق جیسے فوجی ڈکٹیٹر نے اپنے گیارہ سالہ دور میں اسلامی نظام کو جس طرح نظرانداز بلکہ پامال کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن جماعتِ اسلامی کے اس وقت کے امیر نے ان کی حمایت میں فرمایا کہ

"وہ ایک فوجی ڈکٹیٹر ہے تو کیا ہوا اسلام تو نافذ کر رہا ہے۔"

جماعت اسلامی پاکستان کی سب سے بڑی اور روشن خیال مذہبی جماعت ہے۔ اس جماعت کے امیر نے ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"سعودی عرب کے علاوہ کسی جگہ بھی مکمل اسلامی نظام نہیں۔ سعودی عرب میں بھی بادشاہت ہے۔ لیکن وہاں دیوانی اور فوجداری مقدمات کے سلسلہ میں شرعی قوانین نافذ ہیں۔"

(جنگ لاہور ۱۴/۸/۸۳)

گویا ان کے تصورِ اسلام میں شہنشاہیت اور آمریت بھی عین اور مکمل اسلام ہے۔

موجودہ حالات میں اسلام کے نفاذ کے لئے دو محاذ سامنے ہیں۔ ایک محاذ سیاستدانوں کا، دوسرا مذہبی جماعتوں کا۔ دونوں کے عزائم سے آپ واقف ہو چکے ہیں۔ دینِ اسلام کے تقاضے اور ان طبقات کی مصلحتیں متصادم ہیں۔ مذہب کو نظرانداز کر کے دنیا کے سامنے اس دین کو پیش کرنا ہے جو ملّتِ اسلامیہ کی وحدت اور مساوات کی علامت ہے اور جس کی بین الاقوامی اور عالمگیر حیثیت آج بھی صدرِ اوّل کی تاریخ میں محفوظ ہے۔ موجودہ دَور کی اقوامِ عالم، خاص طور پر عیسائی طاقتیں تھیاکریسی کے اندازِ حکومت (جیسا کہ ایران اور سعودی عرب میں نافذ ہے) پر اسلام کا لیبل لگا کر دین کو بدنام کرنے میں مصروف ہیں۔ پاکستان کے لئے یا خود احیائے اسلام کے لئے یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ علامہ اقبالؒ دین کو تھیاکریسی سے پاک کرنا چاہتے تھے اور اسی عزم کے تحت انہوں نے فرمایا تھا کہ

"تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطرتی ملّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔"

"اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری" میں اسی جذبہ کا اظہار ہے۔ وہ اپنے قومی، معاشی، معاشرتی اور روحانی امور کے لئے نسخۂ کیمیا، صرف قرآن کو سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام اُس نہجِ زندگی کا نام ہے جو قرآن کے مطابق

بسر کی جائے۔ چنانچہ اپنی ساری عمر کی قرآن فہمی کا نچوڑ انہوں نے اپنے اس ایک شعر میں پیش کر دیا۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

قرآن کسی نظام کی صداقت کا معیار اس کے قابلِ رشک نتائج قرار دیتا ہے۔ مغربی اقوام کے الزامات کا تدارک ہے کہ پاکستان میں ضابطۂ خداوندی کے نفاذ سے اس کے روح پرور حقیقی نتائج سامنے لائے جائیں اور انہیں عملی طور پر دکھا دیا جائے کہ یہ ہے ہمارا اسلام جس کے نفاذ کے لئے پاکستان جیسا عظیم ملک حاصل کیا گیا تھا۔ انہیں بتایا جائے کہ اگر آپ بھی اپنی اس دنیا کو امن کا گہوارہ اور جنت کا نمونہ بنانا چاہتے ہیں، تو آؤ اس نظام کو اختیار کر کے خود آزماؤ۔ یقیناً یہ دین ایسا ہے کہ جب اور جہاں بھی اختیار کیا جائے وہی نتائج دے گا جو دنیا صدرِ اول میں دیکھ چکی ہے۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

مسلمان

یہ لفظ استعمال کے لحاظ سے دنیا کے ہر گوشے میں بیک وقت کروڑوں زبانوں پر ہوتا ہے لیکن مفہوم کے اعتبار سے اس کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی دو ذہن بھی اس کی متفق علیہ DEFINITION متعین نہیں کر سکتے۔

قرآنِ کریم میں یہ لفظ (مسلمان) اس شکل میں نہیں آیا۔ اس کی جگہ اس میں **مسلم** کا لفظ آیا ہے جس کی جمع **مسلمون** اور **مسلمین** آتی ہے۔ معنوی لحاظ سے مسلم سے مراد ہو گی قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والا یعنی الاسلام کا پیرو۔ لیکن اس کا یہ مفہوم تو الدّین کی رُو سے ہو گا۔ جس میں اسلام کو بطور نظامِ حیات اختیار کیا جائے گا۔ مذہب میں چونکہ خود اسلام کا مفہوم متعین نہیں۔ اس لئے مسلمان کا مفہوم کس طرح متعین ہو سکتا ہے؟ یہ وجہ ہے جو ہمارے علمائے کرام مسلمان کی کوئی متفق علیہ تعریف متعین نہیں کر سکتے۔ یہ علماء خود مذہبی پیشوا ہیں۔ دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ دین میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

(ماخوذ از طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۹۳ء)

حقائق وعبر

قارئین کرام! مناظرہ بحث وجدل سے مراد ہوتی ہے' ایسا اندازِ گفتگو جس سے مقصد حقیقت تک پہنچنا نہ ہو۔ بلکہ یہ مقصد ہو کہ ہم کس طرح فریقِ مقابل سے بازی لے جائیں اور اسے شکست دے کر اس پر غلبہ حاصل کر لیں۔ اس مقصد کے لئے انسان خواہ مخواہ بات بڑھاتا ہے اور اپنے نقطۂ نظر پر اصرار کئے چلا جاتا ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو۔ اسے کج بحثی بھی کہتے ہیں۔

مذہبی دنیا میں اسے مناظرہ کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ بحث و جدال اور یہ مناظرے کفار کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

"کفار کی روش ہمیشہ کج بحثی کی ہوتی ہے (۴۰/۵)۔ حقیقت یہ ہے کہ اس روش کا جذبۂ متحرکہ تکبر (بڑا بننے کی خواہش) ہوتا ہے" (۴۰/۵۶)۔

دراصل بحث ومباحثہ کے ذریعے آپ وقتی طور پر کسی کو لاجواب تو کر سکتے ہیں مگر اس کے دل میں اپنی بات بٹھا نہیں سکتے۔ جب ہم اسلام کے ابتدائی دور پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کہیں بھی اصحابِ کرام رضی اللہ اجمعین مناظرات یا مجادلات میں مشغول نظر نہیں آتے۔ مناظرات کفار کیا کرتے تھے اور اسے تقویت دربارِ ہارون رشید وغیرہ سے ملی ہے۔ بہرحال 'دیلی جتی ادن دیلے' والی بات ہے۔ اب ذرا یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو جو ہفت روزہ 'تنظیم اہلحدیث' کے شمارہ ۵' جلد ۳۸ میں شائع ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"مسلک اہلحدیث کی حقانیت اور مذاہبِ باطل کی حقیقت کے تمام اختلافی مسائل پر بادلائل مناظرانہ تیاری کے لئے فنِ مناظرہ کی کلاس کا اجراء ہو رہا ہے ـــــ تعلیم برائے مناظرہ زیرِ نگرانی سلطان المناظرین' شہسوارِ میدان المناظرہ مولانا حافظ روپڑی مدظلہ تعالیٰ مناظر اہلحدیث عبدالرشید ارشد۔

بہترین مقرر' عظیم مبلغ اور کامیاب منا[ظر] بننے کے لئے علماء اہلحدیث' طلباء اہلحدیث'

وائمہ مساجد جلد از جلد ناظم سے رابطہ قائم کریں۔

یاد رکھئے۔ باطل فرقوں کے پیش کردہ اعتراضات، مغالطات اور شکوک و شبہات کے مدلّل، مفصّل اور مکمل مناظرانہ جواب پڑھائے سکھائے اور لکھوائے جاتے ہیں۔"

دورِ حاضرہ میں مسلک اہلحدیث کی حفاظت اور مداومت کے لئے مناظرانہ کلاسز کا اجراء ـــــ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

صدائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

○

حاجی یا الحاج

ہفت روزہ 'الاعتصام' لاہور رقمطراز ہے کہ

"آجکل مسلمانوں میں یہ عام رجحان ہوگیا ہے کہ اپنے نام کے ساتھ حاجی یا الحاج کا لفظ ضرور لکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ لفظ کوئی ڈگری یا خطاب یعنی سر، خان بہادر وغیرہ نہیں ہے۔ تمام صحابہ کرام (رضی اللہ اجمعین) و امامانِ دین، محدثین و بزرگانِ دین نے کئی مرتبہ حج ادا کیا۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنے نام کے ساتھ حاجی یا الحاج کا لفظ استعمال نہ کیا ـــــ حج تو ایک اسلامی فریضہ ہے جو مسلمان ادا کر لیتے ہیں بس۔ جو مسلمان حاجی یا الحاج کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس سے حج کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حاجی یا الحاج لکھنے سے احتراز کرنا چاہیئے تاکہ ثواب ضائع نہ ہو۔"

بجا ارشاد۔ مگر مولانا، مولوی، امام، حافظ، خطیب، محدث، قدس سرہٗ، اعلیٰ حضرت، مدظلہ العالی، مدظلہم، شیخ الحدیث، شمس العلماء، قبلہ و کعبہ، دام مجدہ، یہ القاب بھی تو کسی اصحابیؓ نے اختیار نہیں کئے تھے۔ پھر یہ کیوں بے دھڑک استعمال ہو رہے ہیں۔

○

وَاَکْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ط (۴/۱۶۱)

۸ مئی کے روزنامہ جنگ، لاہور میں قومی اسمبلی کے ممبران اور سینٹ کے ممبران و دیگر اعلیٰ سرکاری افسران کی فہرست شائع ہوئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ان حضرات کی صحت پر صرف جنوری ۱۹۹۴ء کے پہلے ہفتہ میں ——— ۳،۰۳۱،۷۲۳ روپیہ خرچ آیا (پتہ نہیں سالانہ کیا خرچ آتا ہوگا)۔ اس فہرست میں سب ہی ہیں۔ یعنی نوجوان بھی اور عمر بھی، داڑھی والے بھی اور داڑھی منڈے بھی، ہندو بھی مسلمان بھی، حاجی بھی اور صرف نمازی بھی، حتیٰ کہ ڈاکٹر بھی مریضوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بظاہر صحت مند نظر آنے والے بھی اس فہرست میں سرِفہرست ہیں۔ مثلاً سینٹ کے چیئرمین جناب وسیم سجاد صاحب اور قومی اسمبلی کے سپیکر جناب سید یوسف رضا گیلانی صاحب، حاجی بسم اللہ خان، ڈاکٹر ریحان اور ڈاکٹر کھٹومل جیون صاحب۔

یہ بڑی المناک اور تشویشناک بات ہے۔ اسمبلی میں بیٹھ کر ہماری قسمتوں کے فیصلے کرنے والے اگر بیمار ہوں اور بیمار بھی ایسے کہ جن پر ہفتے میں لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا ہو تو ان کی سیاست، ان کی سوچ فکر، ان کے فیصلے ان کے منصوبے، ان کی تجاویز کیسے صحت مند ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کوئی ترقی نہ کر پائے۔ ہم کولہو کے بیل کی طرح وہیں ہیں جہاں تھے۔ بیمار آدمی کی سوچ تو اپنی صحت تک محدود ہوتی ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

جب ہی تو مرحوم محمد خاں جونیجو نے میری لینڈ بالٹی مور امریکہ کے جان ہاپکنز ہسپتال میں BIX BY JOHN کے نام سے علاج کروایا اور وہیں کرسچین نام سے وفات پائی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بیمار آدمی تو صحت یابی کے لئے دین تک کو داؤ پر لگا دیتے ہیں، قومی اور ملکی مفادات تو کوئی چیز نہیں۔ بیماری ایک بلا ہے، مصیبت ہے اور پھر ایسی بیماری جس پر ہفتہ میں لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا ہو۔ یا ساتر رب۔

حکومت کو چاہیئے کہ آئندہ جو بھی اسمبلی کی ممبرشپ یا سینٹ کی رکنیت کے لئے کھڑا ہو وہ مثالی صحت کا سرٹیفکیٹ پیش کرے تاکہ اس غریب ملک کے خزانے پر بوجھ نہ پڑے۔

درسِ قرآن بذریعہ وڈیو کیسٹ

کراچی (صدر) اور حیدرآباد (قاسم آباد) میں بذریعہ وڈیو کیسٹ سلسلہ وار درسِ قرآن کا اہتمام کیا گیا ہے۔

کراچی

بمقام۔ (۱) فاروق ہوٹل ہال، بالمقابل فٹ رائٹ شوز شاپ، زیب النساء سٹریٹ

وقت۔ ۱۰ بجے صبح ہر جمعہ کو۔

حیدرآباد

(۲) بی۔۲، حیدرآباد ٹاؤن، فیز۔۲، بالمقابل نسیم نگر، حیدرآباد قاسم آباد

وقت۔ بعد نمازِ عصر (شام ۳۰-۵ بجے) بروز جمعہ۔

اوقاتِ درس تیس فیصد رعایت کے ساتھ

قرآنی لٹریچر جملہ مطبوعات طلوعِ اسلام ٹرسٹ اور مجلّہ طلوعِ اسلام کے تازہ شمارے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

نیز

مطلوبہ کتب و رسالے بذریعہ ڈاک یا ٹرانسپورٹ بھی روانہ کئے جا سکتے ہیں۔

رابطہ

ایاز حسین انصاری نمائندہ بزم ڈی ۸ ایئرپورٹ کراچی۔

کراچی فون نمبر: ۴۸۶۲۵۶۹ - ۴۵۷۱۹۱۹ - ۵۶۸۴۳۳۰

حیدرآباد فون نمبر: ۶۵۴۹۰۶

رحمت اللہ طارق

حدود میں عورتوں کی گواہی مُستَرد نہیں ہے

ایک طالبِ قرآن کی نظر میں جنگ' لاہور کے ایک عنوان پر پڑ گئیں جس میں اسلامی نظریاتی کونسل کے حوالے سے لکھا تھا کہ

"حدود کے معاملے میں عورتوں کی گواہی خلافِ اسلام ہے۔ بدکاری رضا سے ہو یا جبر سے نصابِ شہادت کے مطابق چار مسلمان عادل مردوں کی گواہی ضروری ہے۔"

(جنگ لاہور بابت ۱۸ فروری ۹۴ء صا کالم ۷/۸)

یہ پڑھ کر تاسف ضرور ہوا لیکن تعجب نہیں ہوا کہ ہماری مذہبی قیادت قدیم ہی سے خواتین کی زندگی میں زہر گھولنے کی کوشش کرتی رہی ہے اور بعد میں آنے والوں نے بھی ان کا بھرم رکھنے کے لئے مکھی پر مکھی مارنے کی شعوری کوشش جاری رکھ کر عصری تقاضوں کو پاؤں تلے روندنے کا دیرینہ وطیرہ اپنائے رکھا کہ خرابی یہ تھی کہ یہ لوگ اجتہاد کو اپنے اوپر حرام کئے ہوئے تھے۔ لیکن اب اقبالؒ کا دور ہے' سرسیدؒ کا دور ہے' عقل و شعور کا دور ہے' روشن خیالی اور حریتِ رائے کا دور ہے' سائنس اور کائنات میں غور و فکر کا دور ہے' انسان کو بحیثیت انسان دیکھنے کا دور ہے۔ ایسے میں ہوش و حواس کو تج دے کر عالمی اور انسانی مسائل پر خامہ فرسائی کرنا اہلِ علم کو زیب نہیں دیتا۔ اب اجتہاد انسانی سوچ و فکر کا خاصہ' لازمہ بن چکا ہے' اسے نظر انداز کرنا اسلام کی روح اور اسپرٹ کے منافی ہے۔

مردوں کو فحش کاری کا اذنِ عام دے دینا

یہ نظریہ کہ "حدود" میں عورتوں کی گواہی مسترد ہے' عورتوں کو ہر زاویہ سے غیر محفوظ بنا دیتا ہے۔ فرض کرو۔ چھ سات نوجوان بچیاں کالج' سکول' دفتر یا شادی و غمی کے اجتماعات میں شامل ہونے جا رہی ہیں اور راستے میں کوئی مسلح اوباش انہیں ہانک کر کسی ویرانے میں لے جاتا ہے اور دوسیاہی کے لئے کسی ایک کو خاص کر کے دوسریوں کو ایک طرف بٹھا دیتا ہے اور وہ بچیاں کھلی آبروریزی کا مشاہدہ کر کے خاموش رہتی ہیں۔ اوباش فارغ ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا

ہے اور بچیاں تحفظ ملنے کے بعد ملزم کا نشان پتہ اور حلیہ بیان کر دیتی ہیں تو کیا نظریاتی کونسل والے ان سب کی گواہی مسترد کر کے مجرموں کو عصمتوں کے آبگینے چور کرنے کا مستقل اذنِ عام دے کر فارغ ہو لیں گے۔ بخدا یہ قانونِ شرع نہیں ہو سکتا۔ یہ دستورِ محمدؐ نہیں کہلا سکتا۔

گرامر اور ادبیاتِ عرب کا رول

سورۂ نساء میں ہے کہ

"جو عورتیں فحش کاری کرتی ہیں ان پر اپنے لوگوں میں سے چار کی گواہی ہو۔ وہ اگر فحش کاری کی گواہی دے دیں تو ان پر کنٹرول کرنے کے لئے گھروں سے نکلنے نہ دو۔" (نساء: ۱۷)

یہاں فحش کاری کی نوعیت سے بحث نہیں ہے۔ دکھلانا یہ ہے کہ فحش از قبیلِ زنا ہو تو اس کے اثبات کے لئے چار گواہوں کی گواہی ضروری ہے کہ ایسے گواہ کچہری کے اجرتی گواہ نہ ہوں نفسیاتِ گواہی کا عادلانہ شعور رکھنے والے ہوں۔ یہاں تک تو منصفانہ تجویز ہے لیکن آیہ کریمہ میں "اربعۃ منکم" کا لفظ ہے جس کی تعبیر میں فقیہہ شہر کا فرمان ہے کہ 'اربعہ' مردانہ عددی مفہوم دیتا ہے یعنی چاروں گواہ مرد ہی ہوں عورتیں نہ ہوں ـــــ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تعبیر کے لئے نہ تو کسی ادبی حوالہ کا سہارا لیا گیا ہے نہ ہی مفہوم کی حد بندی کے لئے کسی ادبی شہ پارے کو سامنے لایا گیا ہے ـــــ فرض کرو فحش کاری دو مردوں اور دو عورتوں کے مشاہدے میں آئی ہے تو کیا اربعہ کے عددی مفہوم کے مطابق دو عورتوں کے ساتھ دو مردوں کی گواہی بھی مسترد ہو جائے گی کہ چار مردوں کا کورم ٹوٹ گیا ہے یا ان کی گواہی کی بحالی کی اساس پر مشترکہ مشاہدے کا کوئی وزن ہوگا؟ مہربانی ہوگی اگر اس اساس کی نشاندہی کر دی جائے کیونکہ ہمارے نزدیک عربی ادبیات اور وحی کے اسلوبِ خطاب سے واضح ہے کہ خطاب میں مردانہ صیغہ جس طرح مردوں کو حاوی ہے اسی طرح عورتوں کو بھی شامل ہے۔ قرآن جب الذین اٰمنوا کہتا ہے تو اس میں مومن مرد اور مومن عورتیں یکساں شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً کوئی صاحب اسٹیج پر یا ممبر پر چڑھ کر اپنے خطاب میں "خواتین وحضرات" کہنے کی بجائے "حاضرینِ جلسہ" کہہ کر خطاب کرتا ہے تو حاضرینِ جلسہ کا خطاب خود کار حیثیت سے عورتوں اور مردوں کو یکساں شامل ہو جائے گا اور خطاب کے اس انداز کو عمومیت کے دائرے سے نکال کر بغیر قرینے کے خصوص کے خانے میں رکھنا زبان و ادب کی نفی کر دینے کے مترادف ہے۔ اب گرامر و ادب کا شعور ہے تو اتنی وضاحت کفایت کر جائے گی۔

قرآئن اور عینی گواہی کا وزن برابر ہے۔

نساء (۱۵) میں گواہی کا لفظ فاستشھدوا اور فان شھدوا کے پیکر میں آیا ہے جس کی بابت قرآنی

لغت کے امامِ اعظم راغب اصفہانی (۱۱۰۸ھ م) لکھتے ہیں۔ والشھادۃ قول صادر عن علم حصل بمشاھدۃ بصیرۃ او بصر۔
گواہی مُنہ سے نکلی ایسی بات کا نام ہے جو بربنائے معلومات ہو۔ اس میں بصیرت (قرینہ یا صوابدید) کام میں لائی گئی ہو یا چشم دید گواہی ہو، وزن میں برابر ہیں۔ (مفردات راغب طبع دار الفکر بیروت ص۲۷۵ کالم ۱)
اور راغب ہی نے "الشھادۃ" کی ابتدائی تعریف میں بھی اما بالبصر او ما بالبصیرۃ لکھ کر احساس دلایا ہے کہ گواہی کا جس طرح چشم دید گواہی پر اطلاق ہوتا ہے اسی طرح وحی اور استعمالاتِ عرب میں انسان کی صوابدید اور قرائن پر بھی ہوا ہے (ص۲۷۵) کیونکہ قرآن کو حقیقت آفرینی میں وہی مقام حاصل ہے جو اصل اسباب کو ہوتا ہے۔ بات صاف ہو گئی کہ قرائن بھی پختہ گواہی فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب، کسی کی فحش کاری کو چھپ کر عام یا مووی کیمرے میں محفوظ کر لیتا ہے اب وہ اگرچہ تنہا ہے مگر کیمرے کی آنکھ نے اُسے "چار" کا متبادل بنا دیا ہے۔ اسی طرح بہت سے جرائم کی ابتدائی تفتیش میں سدھائے ہوئے کتوں سے کام لے کر اسے صحیح جہت دی جاتی ہے اور یہ درست ہے کہ فقیہہ شہر کے نزدیک عورتوں کی گواہی سے کتوں کی گواہی زیادہ معتبر ہے مگر ہے تو قرآن کی صف کی شہادت تو کیا دو مردوں کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی "قرآن" کی گواہی جتنا وزن بھی نہیں رکھ سکتی تاکہ "اربعہ" کے خود تجویز مردانہ عددی مفہوم میں جگہ پا سکے؟ حقیقت یہ ہے کہ حدود میں خواتین کی گواہی مسترد کر دینا اسلامی خواتین کے حق گواہی پر دانستہ ضرب لگانا ہے۔ اس کی ذمہ داری نہ اسلام پر ہے اور نہ قرآن اور محمدؐ پر ـــ اور یہی وجہ ہے کہ دوسرے ہی دن اخبارات میں فوزیہ حبیب اور دیگر بیسیوں خواتین کے احتجاجی بیانات چھپے جن میں پوری حقارت سے فقہاء کے شعور کی نفی کی گئی بلکہ نظریاتی کونسل کے نئے چیئرمین کو ۲۲ فروری کے اخبارات میں وضاحت کرنا پڑی کہ یہ فیصلہ سابقہ کونسل کا ہے ہمارا نہیں ہے۔

روایت سازوں کا پوسٹ مارٹم

مجھے کھوج لگانے اور غیر فطری فیصلوں کی اصل و بنیاد معلوم کرنے کا شوق ہے اور کدوکاوش کے باوجود مجھے کوئی ایسی حدیث نہیں ملی جو صریح الفاظ میں ـــ حدود میں عورت کی گواہی کو مسترد کر دینے کا درس دیتی ہو۔ تمام کتابوں نے روایت سازوں کے بڑے امام محمد بن شہاب زہری (۱۲۴ھ) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی سنت یہ ہے کہ حدود اور قصاص میں عورت کی گواہی قبول نہ کی جائے۔"

(احکام القرآن مصنفہ جصاص (۹۸۰ھ) طبع مصر جلد ۱/ ۵۹۶ تا ۵۹۸)

یہاں مسلمانوں کی نصف بالغ آبادی کی گواہی کو مسترد کر دینے کے لئے زہری کی بے سند بات کو وزن دے کر لانا اسلام اور قرآن پر گھناؤنا الزام ہے جبکہ زہری مدوایت سازوں کے امام ہوتے ہوئے بھی کسی تقدس کے مقام پر فائز نہیں تھے. خود محدثین کے نزدیک بہت سے روایتی عیبوں میں ملوث تھے اور میرے الفاظ میں "گندا بندہ" یہ روایات میں پیوند لگا کر اپنی بات کو فیصلہ رسولؐ کے پیکر میں پیش کرنے کا عادی تھا. درمیانی واسطے چھوڑ کر فیض رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے براہِ راست لینے کی جعل سازی کا خوگر تھا. ایسے میں ایسے جعلساز کی بات پر اعتماد کر کے شہادتِ نسواں کو مسترد کر دینے کا رسولِ رحمتؐ، ابوبکرؓ اور عمرؓ کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا خاص کر بعد کے تاریخ رجال کے نقادوں نے اس روایت کے تعارف میں حفص بن غیاث (۸۱۰ء) کا نام لے کر ہمارے خدشات کی توثیق کی ہے کیونکہ اس کا دماغی توازن درست نہیں تھا پتہ نہ چل سکتا تھا کہ اس کی روایات خرابیٔ دماغ سے پہلے کی ہیں یا بعد کی؟ اسی حفص نے عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے سے ایک روایت ڈھالی کہ ـــــ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ چلتے بھی جاتے تھے اور کھاتے بھی جاتے تھے. حالانکہ تمام نقادوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ بے سروپا روایت ہے. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کبھی بھی چلتے پھرتے کھانا نہیں کھایا. بات کیا ہوئی کہ حفص خود چونکہ پاگلوں کی طرح بازاروں اور گلیوں میں چلتا بھی جاتا اور کھاتا بھی رہتا تھا. لہٰذا لاشعور میں اس نے اپنے ہی عمل کو عملِ رسولؐ میں ڈھال لیا. خاص کر اس کی بھی اپنے استاد زہری کی طرح عادت تھی کہ جہاں روایت لینے کے لئے متعدد واسطوں کی ضرورت پڑتی وہاں تنہا اپنی ذات کے واسطے سے روایت کر ڈالتا (میزان الاعتدال طبع مصر جلد ۱/ ۲۶۶ وغیرہ).

اور یہ حفص روایت کرتے ہیں. حجاج بن ارطاۃ مفتی بصرہ (۷۶۲ء) سے جو بہت سے محدثین کے نزدیک نہ تو قدآور تھے اور نہ ہی اتنے بلند قامت راوی کہ ان کے منہ سے بیان کردہ روایت سند اور حجت کا کام دے سکتی. وہ گھٹیا قسم کے روایت ساز تھے. بولی لگا کر انصاف بیچنے کا سب سے پہلے اس ہی نے رواج ڈالا. امام شافعی کے لڑکے عبداللہ کہتے تھے کہ اس کا رشوت کا مال چالیس اونٹوں پر اٹھایا جاتا تھا. امام اصمعی فرماتے تھے بصرے میں سب سے پہلے جس قاضی نے رشوت کو جائز کیا وہ حجاج بن ارطاۃ تھا اس نے ایک روایت ڈھالی کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم جب کسی چور کا ہاتھ کاٹتے تو کٹا ہوا ہاتھ دفنائے جانے کی بجائے ملزم کی گردن میں حمائل کر دیتے جبکہ تمام محدث کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایسا کبھی نہیں کیا ـــ (میزان الاعتدال طبع مصر جلد ۱/ ۲۱۳، ۲۱۴)

زہری، حفص اور حجاج بن ارطاۃ کی بابت یہ تفاصیل تاریخ اسلام کے بڑے نقادوں اور فنِ رجال کے ماہر نباضوں امام شمس الدین ذہبی (۱۲۴۸ء) اور علامہ ابنِ حجر عسقلانی (۱۴۴۹ء) نے فراہم کی ہیں ـــ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ حدود میں عورت کی گواہی کو مسترد کر دینے والے جب ایسے لوگ تھے جن کی اپنی گواہی بھی وزن نہیں رکھتی

تھی تو کیا اسلام کا قانونی مزاج گوارا کرے گا کہ شہادت جیسے حسّاس معاملہ میں ان کے دماغی فتور بلکہ اخلاقی اضمحلال کا سہارا لے کر خواتینِ اسلام کے شہری حقوق پامال کئے جائیں ؟

رسول اللہ نے تنہا عورت کی گواہی تسلیم فرمائی

امام نسائی (۹۱۵ء)، امام احمد (۸۵۵ء) اور امام ابوداؤد (۸۸۹ء) سنیوں کے بڑے امام شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ حضرات مل کر حضرت وائل بن حجرؓ (۶۷۰ء) اور محمد بن عبداللہ بن زبیر سے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہدِ مبارک کا ایک ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں جو حدود میں چار ہی نہیں، تنہا ایک عورت کی گواہی پر بھی ملزم کے لئے سزا تجویز فرماتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی امام ابن القیّم (۱۳۵۰ء) اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ

> ایک عورت منہ اندھیرے صبح کی نماز کے لئے مسجد کی طرف جارہی تھی کہ ایک شخص نے راستہ میں پکڑ کر اس سے زیادتی کر ڈالی۔ اب وہ تو بھاگ گیا لیکن نماز کے لئے ایک دوسرا شخص آرہا تھا عورت نے اس سے فریاد کی وہ ملزم کے تعاقب میں دوڑ پڑا، اتنے میں کچھ اور لوگ بھی آگئے، عورت نے ان سے بھی فریاد کی وہ بھی ملزم کے پیچھے دوڑ پڑے۔ اب ملزم تو اندھیرے میں غائب ہو گیا لیکن اس کے تعاقب میں جانے والا پکڑا گیا وہ کہتا رہا کہ میں ملزم نہیں ہوں میں عورت کی فریاد پر تعاقب میں نکلا تھا لیکن عورت نے کہا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اس پر تمام لوگ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے حضور حاضر ہوئے۔ آپؐ نے لوگوں سے مکمل بات سُنکر عورت کی بات پر اعتماد فرمایا اور اصل ملزم کی بجائے تعاقب کرنے والے کو سزا کا حکم سنایا۔ لوگ جب سزا کے لئے اس کو لے گئے تو اصلی ملزم پیش ہوا اور کہنے لگا۔ گناہ میں نے کیا ہے یہ تو مجھے پکڑنے کے لئے تعاقب کر رہا تھا ـــــ اس طرح حقیقتِ حال منکشف ہونے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے تعاقب کرنے والے کو بے قصور ٹھیراتے ہوئے عورت سے فرمایا۔ تیری کوئی خطا نہیں ہے اللہ نے تجھے ردائے مغفرت سے نوازا ہے اور اصل ملزم کے بارے میں بقول راویانِ احادیث حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ نے اس وقت کی رائج سزا سنگساری پر زور دیا۔ آپؐ نے فرمایا اس کی بھی سزا نہیں ہے کہ اس نے ملزم ہو کر اپنے کو قانون کے حوالہ کیا ہے اور جانتا ہے کہ موجودہ حالات میں اس کی سزا موت ہے اس کے باوصف وہ ایک بے قصور انسان کی جان بچانے کی خاطر اپنے کو پیش کر رہا ہے حالانکہ وہ اگر پیش نہ ہوتا تو ایک بے قصور کے ساتھ کیا کچھ ہوسکتا تھا اور اس کا پیش ہونا ایسی توبہ

کا زندہ نمونہ ہے کہ اگر اس توبہ کو تمام اہلِ مدینہ پر تقسیم کیا جائے تو سب کی مغفرت ہو سکتی ہے۔
(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ابن القیم کی ' الطرق الحکمیۃ فی سیاسۃ الشرعیۃ ' طبع مصر
ص ۵۷ و ۵۸ ' بحوالہ فقہ القرآن جلد ۶/ ۲۱۹ ، ۲۲۰)۔

اس واقعہ کا ہر فقرہ ناطق ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے چار تو بڑی بات ہے تنہا ایک عورت کی گواہی کو پذیرائی بخشی اور سزا سنا دی جبکہ تعاقب کرنے والوں کا بیان ہے کہ وہ عینی شاہد نہیں مظلومہ کی فریاد سنکر تعاقب اور تلاش میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے ـــــ جس سے واضح ہوتا ہے کہ رحمۃ للعالمینؐ نے حدود کے بارے میں چار عادل مرد گواہوں کی ضرورت نہیں سمجھی مظلومہ کی ذاتی گواہی کو جو اصولی طور پر رات کے اندھیرے کی گواہی تھی اسے بنیاد بنا کر دیگر قرآن کو مترادف بنا دیا ـــ اسی طرح قصاص میں بھی صحابہ کرام نے تنہا ایک عورت نائلہ زوجہ عثمانؓ کی گواہی پر ہی قاتلانِ عثمانؓ کی شناخت اور تعین کر کے قصاصِ عثمانؓ کا بالاجماع مطالبہ کیا بلکہ مسلمانوں اور صحابہ میں سے حتیٰ کہ واقعہ کے فریق حضرت علیؓ نے بھی تنہا عورت کی گواہی سے مجالِ انکار نہیں پائی جس سے فقیہانِ شہر کے چہرے پر نفسیاتِ شہادت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے طمانچہ رسید ہوتا ہے۔ بات کیا ہوئی کہ حدود ہو خواہ قصاص ' عورت کی گواہی کبھی مسترد نہیں ہوئی۔

ایم بشیر احمد

ربّ العالمین

قرآنِ کریم نے اللہ کا تعارف اس کی صفاتِ عالیہ اور اسماءِ حسنیٰ کے ذریعہ کرایا ہے۔ ان حسین صفات میں سے ایک مہتمم بالشان صفت " ربّ " ہے۔ رب وہ ہوتا ہے جو کسی چیز کی ابتدار سے ہی اس کی تعلیم و تربیت اور ربوبیت شروع کر دے اور اس کو ارتقائی منازل طے کراتا ہوا اس کو نقطۂ عروج و کمال تک لے جائے۔ یہ کام نہایت احسن طریق سے اللہ ہی سرانجام دیتا ہے لہٰذا اسی کو رب کہنا مناسب اور موزوں ہے۔

قرآنِ کریم نے یہ لفظ " ربّ " مختصر صورتوں میں زیادہ تر اللہ ہی کے لئے استعمال کیا ہے۔ خال خال غیر اللہ کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے جہاں اس اس کے معنی محض آقا، مالک یا بادشاہ کے ہیں۔ اس کو بطور جمع ارباب کے بھی استعمال فرمایا ہے جو ظاہر ہے کہ غیر اللہ کے لئے ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ واحد کے لئے یہ صفت بطور جمع کبھی استعمال نہیں ہو سکتی۔ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ کم و بیش ۹۰۰ مرتبہ لایا گیا ہے۔ اگر ان تمام مقامات کا بغور مطالعہ کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے تمام گوشے واضح طور پر سامنے آجائیں گے۔

قرآنِ کریم میں اللہ کو ربّ العالمین کے نام سے بھی کم از کم ۴۲ بار ذکر فرمایا گیا ہے۔ عالمین، عالم کی جمع ہے اور عالم وہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے علم و آگہی اور تعارف و شناسائی حاصل ہو سکے۔ لہٰذا عالمین کا لفظ اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ مختلف جہانوں، نظام ہائے کائنات اور ان سب کے مشمولات کو کلی طور پر محیط ہے اور ان تمام عالمین کا انسان نہ تو اندازہ ہی لگا سکتا ہے اور نہ ہی ان کو کسی طور شمار کر سکتا ہے۔

جب اللہ کو ربّ العالمین کہا جائے گا تو اس کی ربوبیت کے دائرے انسانی عقل و شعور سے بہت زیادہ وسیع ہوں گے۔ ان مختلف دوائر میں سے انسان صرف ان کے متعلق ہی محدود طور پر کچھ جان سکتا ہے جن کا تعلق براہِ راست اس کی ذات سے ہو۔

آیئے ہم دیکھیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے **ربّ العالمین** کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے تو اس کا کیا مقصد و مطلب ہے اور ہم انسانوں کے لئے اس میں کیا کیا سبق و عبرت کے سامان ہیں۔ مکمل طور پر ان تمام مقامات کا احاطہ کرنا اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ ہم چند چیدہ چیدہ مقامات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۱۔ قرآن کی ابتداء ہوتی ہے کہ

الحمد للہ رب العلمین ہ

الرحمن الرحیم ہ مالک یوم الدین ہ (۱/۱-۳)

ہمہ قسم حمد و توصیف، شکر و امتنان صرف اللہ واحد کے لئے وقف ہے جو ربّ العالمین ہے اور ساتھ ہی وہ الرحمٰن ہے، الرحیم ہے اور مالکِ یوم الدّین ہے۔

اللہ ربّ العزّت کی یہ مختلف صفات سامنے لاکر عالمین کے لئے اس کی ربوبیت، اس کی رحمتِ خاصہ اور رحمتِ عامہ اور اس کی صفتِ عدل و انصاف کا خصوصی ذکر فرمایا گیا ہے اور انسان کو باور یہ کرایا گیا ہے کہ اللہ انہی صفاتِ عالیہ کی بنا پر ربّ العالمین ہے۔ اس کی صفاتِ رحمانیت و رحیمیت اور عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ تمام عالمین کی تعلیم و تہذیب، تربیت و ربوبیت نہایت احسن طریق سے نقطۂ آغاز سے لے کر نقطۂ انجام تک کرتا رہے اور یہ کام روزِ آفرینش سے جاری ہے اور روزِ آخر تک مسلسل جاری رہے گا۔

۲۔ اسی حقیقت کا اعادہ ایک اور حسین انداز میں (۱۸۲ ــــ ۳۷/۱۸۰) میں یوں کیا گیا ہے کہ۔ (ہم صرف مفہوم پیش کریں گے آیات قرآنِ مجید میں دیکھ لی جائیں)۔

(۱۸۰) "آپ کا ربّ، جو ربّ العزّت ہے وہ ان تمام بیانات سے مبرّا اور سبحان ہے جو یہ (جاہل لوگ بطور شرک) اللہ کے خلاف دیتے رہتے ہیں۔ (سبحان وہ ذات ہے کہ جس میں کسی قسم کی کوئی خامی، کوتاہی اور نقص قطعاً نہ ہو اور ہر خوبی اور کمال اس میں بدرجہ اتم موجود ہو)۔"

(۱۸۱) "(یہ ازلی حقائق انسانوں کو اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں نے ہی ہر زمانہ میں بتائے۔ لہٰذا) ان مرسلین پر اللہ کا سلام ہی ہونا چاہیئے اور ہے۔"

(۱۸۲) "(اور خود اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ وہ) اللہ ہی ربّ العالمین ہے لہٰذا ہمہ قسم حمد و توصیف اور شکر و امتنان اسی کے لئے وقف ہونا چاہیئے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ عظمیٰ کا ایک اور انداز (۶۶ ــــ ۴۰/۶۴) میں ملاحظہ ہو۔

(۶۴) "یہ اللہ تو وہ عظیم الشان اور رفیع المرتبت ذات ہے کہ جس نے تم سب کے لئے اس زمین کو (باوجود اس کی زبردست سالانہ اور روزانہ گردشوں کے) جائے قرار بنا دیا ہے (کہ نہایت سکون و اطمینان سے اس پر رہتے بستے ہو اور ذرا احساس نہیں ہوتا کہ تم کسی بڑی تیز متحرک چیز پر رہ رہے ہو) اور آسمانوں کو بطور چھت کے تان دیا ہے (کہ وہ بیشمار آفات

سماوی اور مضر اثرات کی حامل شعاعوں سے تمہاری حفاظت کرتا ہے۔ پھر تمہاری (ماؤں کے پیٹ کے اندر ہی) نہایت ہی حسین صورتیں تشکیل دیں۔ اور تم سب کے لئے نہایت ہی طیب (صاف، پاکیزہ، خوش شکل، خوش رنگ، خوش بو، ممدِ صحت، ہمہ قسم خرابیوں اور جراثیم وغیرہ سے پاک) رزق عنایت فرمایا...... تو یہ (تمام کچھ کرنے والا) ہے تم سب کا سب ...... آہاہا! یہ اللہ کیسا برکتوں (اور رحمتوں) والا ہے اور یہی تو ربّ العالمین ہے۔"

(۶۵) "یہی ربّ العالمین ہی تو الحیّ (خود ہمیشہ کے لئے زندہ اور زندگی وحیات کے قوانین کا خالق) ہے اس کے علاوہ دوسرا کوئی (اس طرح کا مطلق بااختیار اور بااقتدار) اِلٰہ ہو ہی نہیں سکتا۔ پس تم سب کا فرض ہے کہ تم دین کو اسی ربّ العالمین کے لئے خالص کردو اور صرف اس سے دعائیں کرو اور اس کو پکارو اور یاد رکھو کہ تمام حمد و ثناء، تعریف و توصیف اور شکر گزاری کا اصل حقدار صرف یہی اللہ واحد ہے اور وہ ربّ العالمین ہے۔"

(۶۶) "اور اے رسولِ کریم (علیہ الصّلوٰۃ والسلام) آپ اعلان فرمادیں کہ جب میرے پاس میرے رب کی طرف سے مبیّنات (واضح احکام وہدایات) آگئی ہیں تو مجھے قطعی طور پر منع فرمادیا گیا ہے کہ تم لوگ جن جن کو اللہ کے علاوہ پکارتے اور ان سے دعائیں کرتے ہو میں ہرگز ہرگز ان کی عبودیت اور محکومیت اختیار نہ کروں مجھے تو حکم ہی صرف یہ دیا گیا ہے کہ اپنا سرِ تسلیم صرف ربّ العالمین کے سامنے ہی جھکادوں۔"

۴۔ اللہ ربّ العالمین کے سامنے سرِ تسلیم خم کردینا اس کا مسلم بن جانا۔ اسلام کو اختیار کرلینا ہی معیارِ عظمت ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

(i) ($\frac{۲}{۱۳۱}$) وہ وقت بڑا ہی قابلِ ذکر اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب جناب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے کہا کہ اسلام لے آؤ، مسلم بن جاؤ۔ مجھے اپنا رب تسلیم کرلو تو آپ نے فوراً اعلان فرمادیا کہ میں اپنا سرِ تسلیم ربّ العالمین کے حضور خم کرتا ہوں (مسلم بن کر اپنے اسلام کا اعلان واقرار کرتا ہوں)۔

(ii) ($\frac{۶}{۷۱}$) جناب رسول اللہ (علیہ الصلوۃ والسلام) سے فرمایا گیا کہ آپ اعلانِ عام فرمادیں کہ اللہ کی (عطا کردہ) ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور ہم کو (مجھے، میرے صحابہ کرام اور تمام متقین کو) حکم یہ دیا گیا ہے کہ ہم سب اللہ ربّ العالمین کے حضور ہی اپنا سرِ تسلیم خم کردیں (اسی کے مسلم بن جائیں)۔

(iii) (۴۴/۲۷) جب سورج پرست ملکۂ سبا کو جناب سلیمان علیہ السلام کے حضور پیش کیا گیا اور اس نے آپ کی شان و شوکت، جاہ و جلال اور اللہ پر ایمان و ایقان کا مظاہرہ بچشم خود کر لیا تو فوراً پکار اٹھی کہ اب تک تو میں (سورج پرستی وغیرہ کی مرتکب ہو کر) اپنے اوپر ظلم ہی کرتی رہی........ لیکن. اب (صدقِ دل اور شرحِ صدر سے) جناب سلیمان علیہ السلام کے ساتھ مل کر اللہ ربّ العالمین کے حضور اپنا سرِ تسلیم خم کرتی ہوں (اور اپنے مسلمہ ہونے کا اعلان کرتی ہوں).

۵۔ (۲۸ - ۵/۲۷). "جب ایک بھائی کی قربانی مقبول ہوئی اور دوسرے کی نامقبول ٹھہری تو اس دوسرے نے پہلے کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا تو اس نے اسے سمجھایا کہ اللہ کے ہاں تو محض متقی لوگوں کی قربانی قبول ہوتی ہے اس لئے تو تقوٰے اختیار کر........ اور اگر تو مجھے قتل ہی کرنا چاہتا ہے تو کم از کم میں پہل نہ کرونگا کہ تجھے قتل کر دوں (البتہ اپنا دفاع ضرور کروں گا یہ میرا حق اور فرض ہے). میں اللہ ربّ العالمین (کے احکام کی خلاف ورزی) سے خوف کھاتا ہوں. تو اللہ ربّ العالمین کی ربوبیت اور تربیت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ظلم و عدوان میں پہل ہرگز نہ کی جائے."

۶۔ (۴۵ - ۶/۴۲) "اللہ کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ جب کوئی قوم باوجود مسلسل انتباہ کے اپنے جرائم سے باز نہ آئے تو اللہ ان کو ابتلا میں ڈالتا ہے اور ان پر ہر قسم کی فراوانی کر دیتا ہے جب وہ اس آسودہ حالی میں مگن اپنے جرائم کا دیدہ دلیری سے ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں تو پھر اچانک اللہ ان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور یوں ان ظالموں کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے (کیونکہ اس کے ربّ العالمین ہونے کا ہی یہ ایک تقاضا ہوتا ہے) اور (ایسے) اللہ ربّ العالمین ہی کے لئے تو سب حمد و ثنا، توصیف و تعریف اور شکر و سپاس وقف ہے."

۷۔ (۶/۱۶۲) "جناب رسول اللہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور آپ کی وساطت سے ہم سب مسلمین کو حکم و ہدایت ہے کہ ہم یہ اعلان کریں (اور اس اعلان کو عملی جامہ بھی پہنائیں) کہ ہماری صلوٰۃ، ہماری عبادات، ہماری حیات و موت سب اللہ ہی کے لئے وقف ہونا چاہئیں جو ربّ العالمین ہے."

۸۔ (۷/۱۵۴) "اللہ ہی نے تمام آسمان اور زمین خلق فرمائے. نظامِ لیل و نہار قائم فرمایا. شمس و قمر اور تمام نجوم کو اپنے امر سے مسخر فرما دیا کہ وہ انسانوں کے لئے کام کر رہے ہیں تو ان تمام حقائق کو مختصر طور پر یوں بیان فرما دیا کہ

لہ الخلق والامر ۰ تبٰرک اللہ رب العالمین ۰ (۷/۱۵۴)

خلق و تخلیق کرنا بھی اللہ ہی کا کام ہے اور اپنی مخلوق میں حکم اور ہدایت کا جاری کرنا بھی اسی کا

کا کام ہے، تو یہ ہے اللہ رب العالمین۔ اور کیسا بابرکت ہے (کہ اس کی برکتوں اور رحمتوں کا کوئی حساب وشمار ہی نہیں)۔

۹۔ تقریباً ہر رسول نے آکر جو اہم اعلان کیا وہ یہی تھا کہ اللہ رب العالمین ہے۔ چند مقامات پیش کئے جاتے ہیں۔

i) (۷/۶۱) "جناب نوح علیہ السلام کی آپ کی قوم نے تکذیب کی اور آپ کو گمراہ تک کہہ دیا مگر آپ نے نہایت سکون واطمینان اور حوصلہ سے جواب دیا کہ اے میری قوم! مجھ میں کسی طرح کی کوئی گمراہی ہرگز نہیں ہے بلکہ میں تو (تمہارے لئے) رب العالمین کی طرف سے رسول ہو کر آیا ہوں"۔

ii) (۷/۶۷) "جناب ہود علیہ السلام کو آپ کی قوم نے کہا کہ آپ ہم کو (نعوذ باللہ) احمق (سفیہ) نظر آتے ہیں مگر آپ نے نہایت صبر وحوصلے سے فرمایا کہ میری قوم مجھ میں کوئی حماقت (سفاہت) بالکل نہیں ہے بلکہ میں تو (تمہاری طرف) رب العالمین کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔

iii) (۷/۱۰۴) "یہی بات جناب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو کہی کہ میں تو یقیناً رب العالمین کا رسول ہوں (جو تم لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہوں)"

iv) (۲۶/۱۶) "جناب موسیٰ اور ہارون علیہم السلام دونوں نے فرعون کے پاس آکر یہی کہا کہ ہم دونوں (تمہاری طرف) رب العالمین کے رسول ہیں"۔

مگر فرعون جیسا باغی وطاغی اپنے علاوہ کسی اور کو رب تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا وہ تو اپنے آپ کو ہی رب الاعلیٰ (۷۹/۲۴) کہتا تھا وہ کسی اور کو رب العالمین کیسے تسلیم کر سکتا تھا اس لئے وہ بول اٹھا کہ "اے موسیٰ! یہ رب العالمین کون ہے (۲۶/۲۴) تو جناب موسیٰ علیہ السلام نے بھرے دربار میں نہایت جرأت اور اطمینان سے کہا کہ

i) وہ آسمان اور زمین کا رب ہے۔

ii) اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اس سب کا بھی رب ہے۔

iii) وہ تمہارے آباء اولین کا بھی رب ہے۔

iv) وہ مشرق اور مغرب کا رب ہے۔

v) اور جو کچھ ان دونوں (مشرق ومغرب) کے مابین ہے اس کا بھی رب ہے (۲۸-۲۶/۲۴)۔

تو گویا جناب موسیٰؑ نے رب العالمین کی مکمل وضاحت فرما دی۔

v) (۸۲-۲۶/۶۹) جناب ابراہیم علیہ السلام کا بیان بھی قابلِ غور ہے۔

"آپ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا کہ تم جن بے کار بتوں کی عبادت میں مگن ہو کیا یہ تمہاری پکار کو سن سکتے ہیں۔ تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں...... تو ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہم

نے اپنے آباء واجداد کو ایسا کرتے دیکھا ہے اور بس۔
آپ نے فرمایا کہ کیا تم جانتے بھی ہو کہ تم لوگ اور تمہارے آباء واجداد جن بے کار بتوں کی عبادت میں لگے ہو یہ سب بے کار اور لاچار ہیں۔ لہٰذا تم اور تمہارے باپ دادا سب گمراہ ہو۔
اور ہاں خوب غور سے سُن رکھو کہ
یہ سب (تمہارے باپ دادا، تم خود اور خصوصاً تمہارے یہ مٹی کے مادھو بے کارِ محض بُت) میرے دشمن ہیں اور دوست صرف (اللہ) رب العالمین ہی ہے (جو میرا دشمن نہیں بلکہ میرا دوست ہے)
یہ اللہ رب العالمین تو وہ ہے کہ
i) جس نے میری تخلیق فرمائی۔
ii) وہی مجھے (راہِ راست کی) ہدایت فرماتا ہے۔
iii) وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔
iv) اور جب میں (اپنی کسی بے احتیاطی سے) بیمار ہوجاتا ہوں تو وہی مجھے (اپنے قانونِ شفا کے ذریعے) شفا عطا فرماتا ہے۔
v) وہی ہے جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ (قیامت کے دن) زندہ کرے گا۔
اور یہی ہے وہ رب العالمین کہ جس سے مجھے قوی امید ہے کہ وہ یوم الدّین کو میری خطاؤں کی مغفرت فرمادے گا۔
یہاں پر جناب ابراہیم علیہ السلام نے بھی رب العالمین کی کچھ صفات کا بیان فرمادیا۔
اگر ہم قرآن کریم میں ان تمام مقامات کا بالاستیعاب مطالعہ کریں جہاں جہاں رب العالمین کا ذکرِ جمیل ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ ہم کو رب العالمین کا مفصّل تعارف حاصل ہوجائے گا۔

۱۰۔ اب رب العالمین کی ایک اور شان ملاحظہ ہو۔ وہ یہ کہ ہر نبی کو اطمینان اور امیدِ واثق تھی کہ اس کی تمام محنت کو کوشش اور تگ و دو کا اجر اللہ رب العالمین ہی عطا کرے گا اس لئے اس نے اللہ کے علاوہ کسی سے اپنے کسی کام کا اجر کبھی طلب نہ کیا۔ چند مقامات پیش کئے جاتے ہیں۔
i) جناب نوح علیہ السلام کا بیان
وَمَا اَسْئَلُكُمْ عليه من اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۲۶/۱۰۹)
میں اپنے کام کا تم لوگوں سے کوئی اجر و معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمّہ ہے۔
ii) یہی بیان جناب ہود علیہ السلام کا ہے (۲۶/۱۲۷)۔

iii) یہی بیان جناب صالح علیہ السلام کا ہے (۲۶/۱۴۵)۔

iv) یہی بیان جناب لوط علیہ السلام کا ہے (۲۶/۱۶۴)۔

v) یہی بیان جناب شعیب علیہ السلام کا ہے (۲۶/۱۸۱)۔

۱۱۔ (۴۷ — ۴۶/۴۳) یہاں پر جناب موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ ہم نے (اللہ نے) جناب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بیّنات دے کر اور رسول بنا کر بھیجا تو آپ نے آ کر ان سے فرمایا کہ میں (تمہاری طرف) یقیناً ربّ العالمین کا رسول ہوں ...... مگر ان لوگوں نے آپ کی محض تضحیک ہی کی۔

۱۲۔ موسیٰ علیہ السلام کی بات کو فرعون اور اس کے سرداروں نے نہ مانی مگر ساحرین نے جب موسیٰ علیہ السلام کی پیش کردہ بیّنات پر غور کیا تو وہ پکار اٹھے کہ

.... اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۝ (۷/۱۲۱؛ ۲۶/۴۷)

ہم ربّ العالمین پر ایمان لے آئے جو موسیٰ اور ہارون کا ربّ ہے۔

۱۳۔ ربّ العالمین کی تربیت اور ربوبیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اس نے انسانوں کی تعلیم و تہذیب اور تربیت و ربوبیت کے لئے نظامِ وحی قائم فرمایا اور اپنی طرف سے انسانوں کے استفادہ کے لئے کتب وحی نازل فرمادیں اور رسول بھیجے)۔

i۔ (۱۰/۳۷) "یہ قرآن ایسی چیز نہیں ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور شخص اس کو افترا کر سکے یہ تو اپنے سے قبل (تمام کتبِ وحی) کا مصدّق ہے اور اس میں الکتاب کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اس میں کوئی ریب اور شک نہیں ہے کہ یہ ربّ العالمین کی طرف سے نازل شدہ) ہے"۔

ii) (۱۹۶ — ۲۶/۱۹۲) "یہ (قرآنِ کریم) یقیناً ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔ اس کو روح الامین لے کر نازل ہوا اور اس نے اس کو آپ کے قلبِ اطہر پر القا کر دیا تاکہ آپ منذر بن جائیں اور یہ قرآن عربی مبین میں ہے اور دراصل یہی قرآن ہی پہلی (وحی کردہ) کتابوں میں موجود تھا۔

iii) (۳۲/۲) "اس میں قطعاً کوئی ریب اور شک نہیں ہے کہ یہ الکتاب (قرآنِ مجید) ربّ العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے"۔

iv) (۸۰ — ۵۶/۷۷) "یقیناً یقیناً یہ قرآنِ کریم ہی ہے جو کتابِ مکنون (محفوظ و مصؤن کتاب) میں (لکھا ہوا) ہے۔

مطہرین (صاف بدن، صاف لباس اور صاف دل و دماغ رکھنے والوں) کے علاوہ دوسرا کوئی اس سے کوئی مَس نہیں رکھ سکتا (نہیں سمجھ سکتا)۔

اور یہ رب العالمین ہی کی طرف سے نازل کردہ ہے"۔

۷) (۴۳ ــ ۴۰/۶۹) "یہ قرآن یقیناً رسولِ کریم کا قول ہے (قرآن نازل کردہ تو اللہ رب العالمین کا ہے جو بالالفاظہٖ آپؐ کے قلبِ اطہر پر القا فرمادیا جاتا تھا مگر لوگوں کے سامنے آپؐ اپنی زبان مبارک سے ان الفاظ کی تلاوت فرمادیتے تھے، تو یوں یہ قرآن اللہ کے نازل کردہ الفاظ میں قولِ رسولِ کریمؐ ہے)۔

یہ کسی شاعر کا قول ہرگز نہیں ہے مگر تم لوگ اس حقیقت پر کم ہی ایمان لاتے ہو۔ اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا قول ہے مگر تم اس پر بھی بہت کم تذکّر (غور) کرتے ہو۔ تو پھر دراصل یہ ہے کیا؟ تو یہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

(تو یہ گویا رسولِ کریم کا قول ہے مگر محض اس لئے کہ آپؐ کی زبان مبارک سے ادا ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ کی ترکیب و ترتیب میں آپ کا کوئی دخل نہیں ہے جب یہ خود رسولِ کریمؐ کا ذاتی قول نہیں ہے تو پھر یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول کیونکر ہو سکتا ہے)۔

۱۴۔ ربّ العالمین کے برابر کسی اور کو سمجھنا محض ضلال اور گمراہی ہے۔ یہ صرف ابلیس اور اس کے عساکر کی انگیخت پر کیا جاتا ہے اور یہ حقیقت یومِ قیامت کو بالکل واضح ہو جائے گی۔

(۱۰۴ ــ ۲۶/۹۱) بڑی ہی اہم آیاتِ بیّنات ہیں اور آنکھیں کھول دینے والی ہیں مگر اکثر لوگ اندھے پن کا شکار رہتے ہیں۔

(۹۱) (یومِ قیامت کو) جحیم (جہنّم) گمراہ لوگوں کو سامنے لایا جائے گا۔

(۹۲ ــ ۹۳) اور ان سے کہا جائے گا جن لوگوں کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتے تھے (آج) وہ کہاں ہیں۔ کیا وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں یا اپنی ہی کچھ مدد و نصرت کر سکتے ہیں۔

(۹۴ ــ ۹۵) تو یہ سب لوگ (سارے گمراہ لوگ) عابد و معبود اور ابلیس کے سارے لشکر اس (جہنّم) میں جھونک دیئے جائیں گے۔

(۹۶ ــ ۱۰۲) اس جہنّم میں ان کے درمیان جھگڑا شروع ہو جائے گا اور کہیں گے کہ اللہ کی ہم یقیناً صریح گمراہی میں ہی تھے جبکہ ہم نے (دوسروں کو) ربّ العالمین کے مساوی اور ہم مرتبہ بنا دیا۔

اور ہم کو ان مجرمین کے علاوہ کسی اور نے گمراہ نہ کیا تھا۔

آج تو ہماری شفاعت (سفارش) کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی گرم جوش دوست ہے۔

اے کاش ہم کو ایک دفعہ پھر دنیا میں واپس جانا مل جائے تو ہم ضرور بالضرور مومن ہو جائیں گے۔

اس (تمام روئیداد) میں یقیناً ایک آیت (سبق اور عبرت) ہے ..... اور ان میں سے اکثر لوگ مومن

نہیں تھے (اور نہ ہی وہ دوبارہ کبھی مومن ہوسکیں گے)۔

اور یقینی امر یہ ہے کہ آپ کا رب ہی تو العزیز اور الرحیم ہے (اس کی عزت اور غلبہ کے سامنے کسی کی کوئی پیش نہ چل سکے گی اور اس کی رحمت ہی تو تھی کہ اس نے دنیا والوں کے لئے اپنے رسول اور کتابیں بھیجیں مگر ان کی بدبختی کہ یہ لوگ ہمیشہ اعراض ہی کرتے رہے)۔

(۹/۴۱) اے رسولِ کریم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) آپؐ ان سے ذرا پوچھیں کہ تم اس ہستی کا انکار کر رہے ہو کہ جس نے اس زمین کو دو ادوار میں تخلیق فرمادیا...... اور اس کے ہمسر اور مدِمقابل بناتے ہو۔ ارے وہ تو ربّ العالمین ہے (اس کا ہمسر اور مدِمقابل کون ہوسکتا ہے)۔

۱۵۔ اللہ خود اپنا تعارف ربّ العالمین ہی سے کرتا ہے۔

i) (۹ــ ۸/ ۲۷) جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اہل وعیال سے فرمایا کہ میں نے آگ دیکھی ہے۔ میں وہاں سے تمہارے لئے کچھ خبر (راستے کی) لے کر آتا ہوں یا کوئی سلگتا ہوا انگارہ بھی لے آؤں گا کہ تم (آگ جلا کر) تاپ سکو۔ جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس آئے تو ان کو ندا دی گئی کہ جو کوئی اس (ظاہری) آگ میں ہے وہ تو بڑی برکتوں والا ہے اور جو کوئی اس آگ کے اردگرد ہے وہ بھی بڑی برکتوں والا ہے، وہ اللہ سبحان ہے (وہ اللہ جو ہر نقص سے پاک اور ہر خوبی کا حامل ہے) وہ ربّ العالمین ہے۔

ii) (۳۰/ ۲۸) جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس آئے تو ان　　مبارک قطعہ (ارض) میں وادی کے دائیں کنارے سے ایک خاص درخت میں سے ندا دی گئی کہ اے موسیٰؑ (علیہ السلام) یقیناً میں اللہ ربّ العالمین ہوں۔

۱۶۔ شیطان کی دھوکا بازی اور فریب۔

(۱۷ــ ۱۶/ ۵۹) بے عقل لوگوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان کی مثال شیطان کی طرح ہے کہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر اور انکار کردے۔ جب وہ اس کے کہنے لگ کر کفر کرلیتا ہے تو شیطان کہنے لگتا ہے کہ میں تو تجھ سے بری الذمہ ہوں۔ میں تو ربّ العالمین سے خوف کھاتا ہوں۔

مگر ان دونوں (شیطان اور اس کے متبعین) کا انجام یہ ہوگا کہ وہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہیں گے (کیونکہ یہ دونوں ظالم تھے) اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔

۱۷۔ جناب ابراہیم علیہ السلام کا براہِ راست لوگوں سے سوال۔

(۸۷ــ ۸۵/ ۳۷) وہ وقت بڑا قابلِ ذکر ہے کہ جب جناب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا کہ آخر تم کن (فضول) چیزوں کی عبادت میں لگے ہو۔ کیا اللہ کے علاوہ یہ جھوٹ موٹ کے گھڑے

ہوئے بت اور معبود نہیں کہ جن کی عبادت کا تم نے ارادہ کر رکھا ہے (تو اگر عبادت انہی جھوٹے بتوں ہی کی ہو سکتی ہے تو مجھے یہ تو بتاؤ کہ) پھر ربّ العالمین کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔

۱۸۔ ملائکہ کی حمد۔

(۳۹/۷۵) اور آپ دیکھیں گے کہ ملائکہ عرشِ الٰہی کے گرداگرد گھیرا باندھے ہوئے ہیں اور اپنے ربّ کی حمد میں مصروف ہیں۔ اور اس وقت لوگوں کے درمیان نہایت حق اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ

ہر قسم حمد و ثنا، توصیف و تعریف اور شکر و امتنان تو صرف اور صرف اللہ کے لئے ہے جو ربّ العالمین ہے۔

۱۹۔ مومنینِ قرآن کا فرض ہے کہ وہ اپنی منشاء و مرضی کو اللہ ربّ العالمین کی مرضی کے تابع کر لیں۔

(۸۱/۲۵—۲۹) یہ قرآنِ کریم شیطانِ رجیم کا قول ہرگز نہیں ہے، تو پھر تم کدھر کو (لپکے) جا رہے ہو۔
یہ تمام عالمین کے لئے ذکر و نصیحت ہے کہ تم میں سے جو شخص چاہے وہ صراطِ مستقیم پہ گامزن ہو جائے۔
اور پھر تم لوگ وہ کچھ کیوں نہیں چاہتے اور تمنا کرتے جو ربّ العالمین چاہتا ہے (یعنی تمہاری منشا اور آرزو اللہ ربّ العالمین کی مشیت کے تحت ہونا ضروری ہے)۔

۲۰۔ وہ مبارک دن کہ جب تمام لوگ اللہ ربّ العالمین کے لئے قائم اور ایستادہ ہو جائیں گے۔

(۸۳/۴—۶) کیا ان لوگوں کا یہ گمان ہے کہ وہ اٹھائے نہ جائیں گے (ان کی بعثت نہ ہوگی)۔
وہ ایک عظیم دن کو ضرور بالضرور اٹھائے جائیں گے۔
اور یہ وہ دن ہو گا کہ تمام بنی نوعِ انسان ربّ العالمین کے حضور (اس کے احکام کماحقہٗ بجا لانے کے لئے) قائم اور ایستادہ ہو جائے گی۔

ہم نے حسبِ توفیق قرآنِ کریم سے ربّ العالمین کا کچھ تعارف کرایا۔ یہ کام بڑا عظیم ہے اور بہت بڑے صاحبانِ علم کا حصہ ہے کہ وہ اس عظیم کام کو سرانجام دیں۔
بہرکیف جو کچھ ہم سے بن پڑا ہم نے قرآنِ کریم کے بحرِ ذخار سے چند لولوئے آبدار قارئین کرام کی نظر کر دیئے۔ اللہ ہم سب کو اللہ ربّ العالمین کی شانیں سمجھنے اور ان کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آخر میں عرض ہے کہ اللہ ہمارا ایمان و عمل قبول فرمائے اور ہم کو جناتِ نعیم سے سرفراز فرمائے جہاں کے رہنے والے خوش بخت و خوش خصال لوگوں کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ

دَعْوٰھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَ تَحِیَّتُھُمْ فِیْھَا

سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؏ (۱۰/۱۰)

جب ان جنات نعیم کے خوش خصال اور خوش حال باسی اللہ کی نعمتوں کو پے در پے
نازل ہوتا دیکھیں گے تو بے ساختہ پکار اٹھا کریں گے کہ
سبحان اللہ

اور آپس میں ان کی گفتگو اور قیل قال بھی سلام سلاماً ہوگی اور بالآخر جو کلمہ طیب ان کی زبان سے ادا ہوا
سے ادا ہوا کرے گا وہ یہی تو ہوگا کہ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؏ (۱۰/۱۰)

نظریۂ پاکستان

ہم نے دیکھا ہے کہ اسلام بحیثیت دین (نظامِ زندگی) اسی صورت میں کارفرما ہو سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اگر اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو یہ صرف مذہب کی شکل میں باقی رہ سکتا ہے۔ ہندوستان میں اسلام مذہب کی حیثیت میں باقی رہ سکتا تھا۔ دین کی شکل اختیار نہیں کر سکتا تھا اسے دین کی صورت میں متشکل کرنے کیلئے ہم نے ایک آزاد مملکت کے حصول کا مطالبہ کیا۔ اسی کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں یعنی ایک ایسی مملکت کا حصول جس میں اسلام ایک عملی نظامِ حیات کی شکل میں کارفرما ہو۔ بنابریں نظریۂ پاکستان بھی کوئی ہنگامی تصور نہیں تھا۔ یہ اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ داعیانِ نظریۂ پاکستان سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے تھے کہ اسلام صرف اپنی آزاد مملکت میں دین کی شکل اختیار کر سکتا ہے اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو اس کے دین بننے کا امکان نہیں ہوتا۔ اس صورت میں اسلام مذہب بن جاتا ہے اور اسٹیٹ سیکولر جو یکسر غیر اسلامی تصور ہے۔

(ماخوذ از طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۳ء)

راجہ عبدالرزاق

قرآن اور نفاذِ اسلام

یہ امرِ لاریب مسلّمہ ہے کہ کسی بھی خطۂ زمین پر نفاذ الاسلام ممکن العمل نہیں جب تک مملکت و حکومت کی بنیاد قرآنِ کریم پر' اسوۂ رسول محمد رسول اللہ کی روشنی میں قائم نہ کی جائے اور ارشاداتِ الٰہی (۱) فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (اے رسول) تم ان کے فیصلے (حکومت کا قیام) بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (قرآنِ کریم) کے مطابق کرو (۵/۴۸)۔ (۲) اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ (اے رسول کہہ دے) میں تو (ہر صورت میں) وحیٔ خداوندی (قرآنِ کریم) کا اتباع کرتا ہوں (۶/۵۰؛ ۷/۱۰۳؛ ۱۰/۱۵؛ ۴۶/۹) ..... کے مطابق تمام معاملاتِ زندگی کے فیصلے بہر صورت ...... قرآنِ کریم کی تعلیمات اور مقتضیات کی روشنی میں کماحقہٗ نہ کئے جائیں !!!

چنانچہ اس وقت فیصلہ طلب مسئلہ یہ نہیں کہ الاسلام مذہب ہے یا دین اور یہ کہ قرآنِ کریم محض تلاوت برائے ثواب اور مذہبی رسوم و عقائد کی سند اور تعمیل و تکمیل تک محدود ہے یا یہ کہ ملّتِ اسلامیہ کھلے ہوئے شرک (۳۰/۳۰ـ ۳۱) گروہ بندی کی شکار ہے .... اور بوجوہ نہ صرف خود بلکہ پوری نوعِ انسانی کو دین الاسلام (۳/۱۹) کی تعلیمات اور مقتضیات کے اتباع سے محروم کئے ہوئے ہے۔ (یاللعجب)

یہ سب باتیں اب کوئی راز نہیں بلکہ کھلی ہوئی کتاب کی صورت میں ہر صاحبِ بصیرت انسان کے سامنے اور واضح ہیں' لہٰذا انہیں بار بار پیش کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ــ اگر کوئی ضرورت ہے تو وہ اس امر کی ہے کہ اس صورتِ حال کی اصلاح کس طرح کی جائے اور یہ کہ اس سلسلہ میں خود قرآنِ کریم میں کیا رہنمائی موجود ہے۔

بایں ہمہ! یہ امرِ مسلّمہ حقیقت ہے کہ بنی نوع انسان' آج جس قدر ناہمواریوں اور تباہی و بربادی سے دوچار ہے' یہ سب کچھ شعور' اختیار و ارادہ اور ان کے تعلق سے مختلف افراد کی سمجھ میں فرق اور ان کی ذہنی صلاحیتوں اور علمی نسبتوں کے اعتبار سے کمی و بیشی کے پیدا کردہ اختلافِ رائے کا شاخسانہ ہے۔ درآں حالیکہ ایسی اختلافِ رائے ہی انسانی ارتقاء و بقاء کی بنیاد ہے بشرطیکہ قرآنِ کریم میں عطا کردہ احکام اور اصولوں کے مطابق عمل کیا جائے جو درج ذیل ارشادِ خداوندی کے اندر واضح اور کھلی ہوئی ہدایات کی صورت میں موجود ہیں۔

ارشادِ خداوندی " اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو (تو اگر خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو) تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو .... یہ بات بہت اچھی ہے" (۴/۵۹) - (ترجمہ مولا فتح محمد خاں جالندھری) .... کے مطابق متعلقہ اختلافات کو اصلاح و فلاح بلکہ ارتقاء و بقا کا ذریعہ بنانے کے لئے خدا اور رسولؐ کے حکم کی طرف رجوع کرنے کے لئے قرآن اور سُنّۃ (اسوۂ حسنہ) کی روشنی میں مجاز اتھارٹی سے فیصلہ (۵/۴۸) حاصل (۶/۵۰؛ ۷/۱۰۳؛ ۱۰/۱۵؛ ۹/۴۶) کیا جائے۔

یاد رہے! قرآنِ کریم میں جو حقائق' اقدار' احکام اور اصول بیان ہوئے ہیں انہیں ہر دَور میں اس کی علمی اور ادبی سطح کے مطابق سمجھا جائے گا۔ اس لئے ہر نئے دور میں ان کے مفہوم میں سابقہ دور یا ادوار سے (عملی صورت میں) فرق ہو سکتا ہے۔ اس طرح ایک ہی دور میں مختلف افراد کی سمجھ میں بھی فرق بہر طور ممکن ہے بشرطیکہ کوئی شخص یا اس کے ہمنوا' متعلقہ مفہوم کو حرفِ آخر نہ سمجھ لیں اور اسے عقائد کا درجہ دے کر امت بلکہ نوعِ انسانی میں تفرقہ کی صورت پیدا نہ کریں .... اور مستحقِ سزا (۶/۱۶۰) نہ بنیں؟

قرآنِ کریم کے احکام کا جہاں تک تعلق ہے ان میں ہرگز ہرگز کسی قسم کا اختلاف یا تضاد نہیں۔ اس لئے کوئی بھی اختلافی صورت الاسلام کی تعلیمات اور مقتضیات کے منافی ہے۔ اس سے فرقے پیدا ہوتے ہیں جسے قرآنِ کریم میں کھلا ہوا شرک قرار دیا گیا ہے (۳۰/۳۱-۳۲) جبکہ شرک نہ صرف ناقابلِ معافی ہے بلکہ مشرک کے لئے تو ترازو تک نہ رکھا جائے گا۔

چنانچہ! قرآنِ کریم کے اصولی احکام کی زماں اور مکاں کے مطابق جزئیات کا تعین فرد کا نہیں' اسلامی نظام مملکت و حکومت کا فریضہ ہے (۳/۱۰۴)۔ جو صورت و شکل متعلقہ نظام کی طرف سے متعین ہو گی اس کا اتباع تمام افرادِ ملت کے لئے لازمی بلکہ فرضِ عین ہو گا۔ نیز جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ (۱۲/۴۰؛ ۱۸/۲۶) بلا شرکتِ غیرے اقتدارِ اعلیٰ بما انزل اللہ (۵/۴۸) قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی (۵/۴۹) کی صورت میں قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآنِ کریم میں اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف منسوب ذمہ داریاں اس نظام نے سرانجام دینی ہیں۔ جو قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی کی صورت میں قائم ہو گا ..... مثلاً قرآنِ کریم میں ہے " ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ (۷۵/۱۹) "تحقیق! پھر (قرآنِ کریم) کا بیان (تعبیر و تشریح) ہماری (اللہ کی[1]) ذمہ داری ہے۔" یہ اللہ

---

[1] یاد رہے "عالمِ امر" میں جہاں اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات مختارِ مطلق اور تمام امور کی سزاوار ہے۔ وہاں "عالمِ خلق" میں سنّت اللہ کے تحت متعلقہ امور سرانجام پاتے ہیں' البتہ بنی نوعِ انسان جسے خلیفہ فی الارض (مشیّتِ ایزدی کے مطابق با اختیار و ارادہ مخلوق) ہونے کی سعادت حاصل ہے بحدِ بشریت طبعی' خا[illegible]نی قوانین کے سلسلہ میں عمل

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کی ذمہ داری متعلقہ اسلامی نظام کی طرف سے بھی مقرر کردہ اتھارٹی (عدالتِ عظمیٰ) ادا کرنی ہے ۱۱۱
اس طرح امت میں اختلاف رائے تفرقہ کی صورت اختیار نہیں کرے گا، بلکہ باعثِ اصلاح اور برکت بنے گا کیونکہ وحدتِ امت قرآنی تعلیمات کا بنیادی و اساسی تقاضا ہے جبکہ اختلاف رائے اصلاح و فلاح تو جائز ہے تفرقہ و گروہ بندی کے لئے ہرگز نہیں۔ چنانچہ اس طرح تفرقہ اور فرقہ بندی الاسلام کی نقیض ہے اور یہ وہ ناپسندیدہ صورت ہے جسے قرآنِ کریم میں اللہ کا عذاب قرار دیا گیا ہے (۶/۶۵)۔

بدیں صورت! اس طرح کسی ایک مسلم اکثریت والی مملکت، خاص کر مملکتِ خداداد پاکستان جس کے آئین مملکت (COSTITUTION) میں الاسلام کے نفاذ سے متعلق سو فیصد ضمانت ..... درج ذیل نکات کی صورت میں موجود ہے۔

(۱) چونکہ اللہ تبارک تعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلا شرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور پاکستان کے جمہور کو جو اختیار و اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہوگا۔ وہ ایک مقدس امانت ہے .... (وہ یہ کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوگا اور یہ اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود "قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی" (۴۹ — ۵/۴۸) کی صورت میں قائم کیا جائے گا)۔ (دستورِ پاکستان اردو ترجمہ تمہید ص۱)

(۲) بانئ پاکستان قائداعظمؒ کے اس اعلان سے وفاداری کے ساتھ کہ پاکستان عدلِ عمرانی کے اسلامی اصولوں پر مبنی ایک جمہوری مملکت ہوگی ..... (وہ یہ کہ حضرت قائداعظمؒ کے اقوال، خاص کر قولِ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن ۱۹۴۱ء "اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں، الاسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ شخص یا ادارے کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی ہے۔ جس کے لئے لامحالہ آپ کو ایک الگ خطۂ زمین ضرور چاہیئے (بمطابق نصِ قرآن ۱۲/۴۰؛ ۱۸/۲۶؛ ۵/۴۸؛ ۲۲/۴۱) ..... کی روشنی میں مملکتِ خداداد پاکستان میں جزئی قانون سازی کی جائے۔
(دستور پاکستان .. اردو ترجمہ .. تمہید ص۲)

سابقہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ ۱
کی حد تک ..... آزاد ہے لیکن نتائج بہرحال سنتہ اللہ کے مطابق ..... ظہور پذیر ہوتے ہیں چنانچہ بنی نوعِ انسان جو بہرطور مخلوق ہے اس کا اختیار و ارادہ سنتِ اللہ کے تابع اور مشیتِ الٰہی کا مرہونِ منت ہے (۵۱/۵۶ ؛ ۵۹ — ۳/۱۵۸)۔

(۳) پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق مرتب کرنے کے قابل بنانے کے لئے اور انہیں ایسی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں جن کی مدد سے وہ قرآنِ پاک اور سنّت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں۔

(دستور پاکستان، دفعہ ۳۱، اُردو ترجمہ، ص۱۸)

(۴) نیز: تمام موجودہ قوانین کو قرآن پاک میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا۔ اور ایسا کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو مذکورہ احکام کے منافی ہو۔" (دفعہ ۲۲۷، اردو ترجمہ، ص۱۲۵) کے مطابق! دین الاسلام کو آئینی و قانونی طور پر نافذ العمل کیا جائے۔ وہ اس طرح کہ عدالتِ عالیہ فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ کے متعلقہ بنچ سے الاسلام کے طرزِ حکومت کو متعین کرایا جائے جس کے مطابق مقننہ جزئی قانون سازی کرے اور ان جزئی قوانین کو متعلقہ انتظامیہ نافذ العمل کر کے "قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی قائم کرائے ...."[1]

بایں صورت! مملکتِ خداداد پاکستان میں قائم "اللہ تبارک تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ" (۱۲/۴۰) کو بلا شرکتِ غیرے (۱۸/۲۶) کی صورت میں بطور نمونہ، نہ صرف دیگر مسلم اکثریت والے ممالک میں قائم کئے جانے کی راہ نکالی جائے بلکہ ترغیب و تبلیغ کے ذریعے غیر مسلم ممالک میں بھی الاسلام (۳/۱۹) کو "حقِ خود اختیاری" کی بنیاد پر نبوت و رسالت کے ورثہ نیز تمام نوعِ انسانی کی میراث اور نظامِ زندگی (الدین) کے طور پر اپنانے کی سبیل پیدا کی جائے۔

اس طرح! الاسلام جس کے اصطلاحی معنی و مفہوم "خود سلامتی سے رہنا، دوسروں کو نہ صرف سلامتی سے رہنے کا حق دینا، بلکہ ممد و معاون بننا ہے" "LIVE, LET LIVE RATHER HELP TO LIVE" کے یکتا و لاثانی کردار کو جہاں واضح طور پر عملی صورت میں پیش کیا جائے وہاں اس مسلمہ حقیقت کو بھی پوری شد و مد سے بیان کیا جائے (کہ) الاسلام ہی وہ الدین ہے جو ہر نبی و رسولؑ پر وحی کیا گیا اور بوجوہ تمام سابقہ کتب میں حوادثِ زمانہ ناموافق کے تحت تحریف، آج صرف اور صرف قرآنِ کریم میں اپنی مکمل اور محفوظ صورت میں بفضل اللہ تعالیٰ موجود ہے۔ لیکن! جس طرح پہلے انبیاء کی امتوں نے یکے بعد دیگرے متعلقہ مقدس صحائف میں نہ صرف تحریف کی بلکہ اپنے خود ساختہ عقائد اور رسوم کو بھی ان کا جزو بنا دیا (۲۲/۵۲)۔ اسی طرح محمد رسول اللہ کی عظیم الشان امت نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآنِ کریم کی تعلیمات کو وضعی، لیکن آپؐ کی طرف منسوب روایات کے تحت رسمی عقائد

---

[1] یاد رہے! اسلامی حکومت میں اللہ تبارک تعالیٰ کا اقتدارِ اعلیٰ، عیسائی مملکت میں آسمان کی بادشاہت اور کمیونسٹ نظام میں، مثالی معاشرہ کا تصور، قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی کے قیام سے ہی معرضِ وجود میں آسکتا ہے!

افعال تک محدود کر دیا (۲/۷۹) .... درآں حالیکہ! زمانہ بھر پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے (کہ) قرآنِ مجید مکمل اور محفوظ کتاب ہے اور اسے بطور الدّین نافذالعمل کر کے ہی کماحقہٗ استفادہ کیا جا سکتا ہے (۳/۱۰۳)۔ البتہ! جہاں رسمی عقائد اور افعال سے بلند و بالا ہو کر الاسلام کو مسلم اکثریت والے ممالک میں آئینی و قانونی طور پر بطور "الکتٰب (۲/۲) "آئینِ زندگی نافذالعمل کرنا ہے وہاں ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان ممالک میں۔ لندن (برطانیہ) میں مسلم انسٹی ٹیوٹ کے پلیٹ فارم سے جناب کلیم صدیقی کی رہنمائی میں اختیار کئے گئے طریق کار "مسلم اسمبلی کے قیام کے ساتھ ساتھ برصغیر ہند میں ملّتِ اسلامیہ کو حاصل جداگانہ حقِ نمائندگی کی طرح! تمام غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کے لئے ملی بنیادوں پر حقِ نمائندگی حاصل کرنا ہو گا۔ جیسا کہ یہ حق اس وقت غیر مسلموں کو آئینی و قانونی طور پر پاکستان میں حاصل ہے۔ یاد رہے۔ یہ حق اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کے تحت بھی حاصل کیا جا سکتا ہے ......

اس طرح غیر مسلم ممالک میں ملّتِ اسلامیہ کو ملّتِ غیر اسلامیہ کے مقابلہ میں جب تک آئینی و قانونی طور پر اکثریت حاصل نہیں ہوتی۔ اس وقت تک متعلقہ ممالک میں تبلیغ و تربیت کے ساتھ رضاکارانہ طور پر اسلامی اقدار، احکام اور اصولوں کی بنیاد پر اصلاحِ احوال کے لئے سماجی، معاشرتی اور معاشی خدمتِ خلق کو اپنایا جائے گا اور اس انسانیت پرور رفاہی پروگرام کو بحُسنِ کمال پورا کرنے کے لئے صدقات کی بنیاد پر متعلقہ ممالک میں بیت المال (۹/۶۰؛ ۹/۱۰۴) قائم کیا جائے گا۔ جو دو ملّی نظریہ، اتحاد و عمل اور "من ینفع الناس فیمکث فی الارض" کا شاہکار ہونے کے ساتھ "وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا (۱۱/۶)" متعلقہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے سزاوار نظام کا پیش خیمہ بھی بنے گا ...... ///

بدیں صورت! جہاں ممکنہ حد تک مسلم اور غیر مسلم (ملّتِ اسلامیہ اور ملّتِ غیر اسلامیہ) نوعِ انسانی کی بقا اور ارتقاء کے لئے مل کر کام کریں گے وہاں الاسلام "خود سلامتی سے رہنا، دوسروں کو نہ صرف سلامتی سے رہنے کا حق دینا بلکہ ممد و معاون بننا" کے معنی و مفہوم کی نسبت سے متعلق مشن کو کماحقہٗ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ممکنہ کوشش اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کے حدود کے اندر رہتے ہوئے کی جائے گی۔

بایں ہمہ! اس سلسلہ میں آغازِ کار کے لئے ایک صائب الرّائے افراد پر مشتمل گروپ کی بہرحال ضرورت ہو گی جو اپنے مشن کا آغاز قرآنی فکر و تدبّر کی روشنی میں مسلم اور صرف مسلم کے طور پر پورے اعتماد سے واضح اور کھلے پروگرام کے ساتھ کرے۔ اس گروپ کے اصحاب کا انتخاب اعلیٰ قدروں کے مالک افراد سے ہو۔ جو عہدہ طلبی (امارت) سے متعلقہ قرآنی احکام اور اصولوں (۲۸/۸۳؛ ۳۲ ـ ۳۰/۳۱؛ ۵۹/۷) نیز احادیثِ مبارکہ رسولِ کریمؐ، حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مروی (قلقشندی صبح الاعشیٰ ج ا صفحہ ۲۲) پر پورا اتریں۔

اس طرح حصولِ اقتدار کے لئے جہاں تقویٰ، احکام الٰہی و سنتِ رسولؐ (اسوۂ حسنہ) کو ملحوظ رکھا جائے وہاں مملکت سے متعلقہ آئینی و قانونی جزئیات کا بھی پورا پورا احترام کیا جائے اور اپنے مشن کے اعلیٰ مقاصد کے شایانِ شان اقدامات اٹھائے جائیں۔ اس سلسلہ میں ان صاحبِ کردار و افعال افراد سے رابطہ و تعلق پیدا کیا جائے جو اپنے معاملاتِ زندگی میں اعلیٰ اقدار اپنائے ہوں ان اداروں سے استفادہ کیا جائے جو پاکیزگی کی بنیاد پر قائم ہوں اور نوعِ انسانی کی فلاح و اصلاح اور بقاء و ارتقا کی ضمانت مہیا کریں۔

ابتدا صفر سے کی جائے، نگاہ منتہٰی منزل پر رکھی جائے تاکہ مایوسی سے بچا جا سکے اور کامیابی کی طرف منزل بہ منزل بڑھا جائے۔ نظریہ کے بعد انسانیت کو بنیاد بنایا جائے۔ اقتدار اور شخصیت ذات بالمقصود ہونی چاہیئے۔ صدقہ کو ہر عمل کا معیار بنایا جائے یعنی ایمان و یقین کا اظہار، قربانی اور ایثار واضح اور کھل کر ہو جس کی بنیاد بہرحال استطاعت پر ہو۔ اوّل و آخر " ما ینفع النّاس فیمکث فی الارض" کو معیار بنایا جائے (۱۳/۱۷)۔ اور ارشادِ الٰہی (۱۱/۶) کے مطابق ایک ایسے معاشی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کی جائے جس میں تمام مخلوق کی نشوونما بحسن و کمال اور منزہ و مبرّا طریقہ سے ہو سکے۔

بایں صورت، تحریک اور قیامِ پاکستان نیز حضرت قائداعظمؒ محمد علی جناح کے فرمودات ....!

۱۔ پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف آزادی حاصل نہیں کرنی ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصورات نیز اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

۲۔ اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ سب اس بات میں مجھ سے متفق ہوں گے کہ ہم خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں آخر الامر مسلمان ہیں۔ لہٰذا اگر آپ ایک ملت بننا چاہتے ہیں تو خدا کے لئے صوبجاتی تفریق کو خیرباد کہیئے۔ صوبجاتی تفریق اور مذہبی فرقہ بندیاں شیعہ سنی وغیرہ لعنت ہیں۔

۳۔ آج انسانی سعی و عمل کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کر سکتے۔

۴۔ پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا۔ بلکہ ایک عظیم مقصد کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور سانس لے سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔

۵۔ ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں (پاکستان) کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کرسکیں۔ اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہوسکے گا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو اسلامی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی طریق ہے جس سے ہم اس فریضے (اسلامی نظام کا قیام اور امتِ مسلمہ کا الگ تشخص قائم کرنے) سے عہدہ برآ ہوسکیں گے .... جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت عائد ہوتا ہے، ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچائے اور نوعِ انسانی کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہوسکے .... یہ کچھ کسی اور نظام سے نہیں ہوسکتا۔

۶۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ شخص نہ ادارے کی، قرآن کریم کے احکام ہی سیاست اور معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرسکتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی ہے جس کے لئے لامحالہ آپ کو الگ خطہ ضرور چاہیئے .... ! کی عملی تعبیر منصۂ شہود پر آسکے اور یہ زمین اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے (۳۹/۶۹)۔

سچے موتی

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زائد ہو وہ اس آدمی کو دیدے جسے اس کی ضرورت ہو، جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اسے دیدے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔ (مسلم)

بچّوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

شہادت

گواہی مت چھپاؤ کسی بات کا عدل کے ساتھ فیصلہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جس شخص کو اس کی بابت کچھ علم ہو، وہ سامنے آکر سچّی سچّی بات بیان کر دے (اسے گواہی یا شہادت کہتے ہیں اور گواہی دینے والے کو شاہد)۔ قرآنِ کریم نے اس کی بابت بڑی تاکید کی ہے۔ اس نے پہلے یہ کہا ہے کہ

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ (۲/۲۸۳)

"گواہی کو کبھی چھپاؤ نہیں۔"

انصاف کے ساتھ جو کچھ تمہیں معلوم ہو، اسے بلاکم و کاست (ٹھیک ٹھیک سامنے آکر بیان کر دو۔ اس میں انصاف کا پورا پورا لحاظ رکھو۔ نہ کسی کے خلاف جاؤ اور نہ کسی سے رعایت کرو۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ (اے ایمان والو! انصاف کو ہر حال میں قائم رکھو ۴/۱۳۵)۔ اور یہ گواہی کسی خاص پارٹی کی طرف سے دینے کے لئے نہ آؤ۔ (شُهَدَاءَ لِلَّهِ) خواہ یہ سچّی گواہی خود تمہارے اپنے ہی خلاف کیوں نہ جائے (وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ) یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ

ہو (اَوِالْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ) خواہ کوئی امیر ہو یا غریب ہو (اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا) تم کسی کی طرفداری مت کرو. ان سب کے مقابلے میں اللہ کا تم پر زیادہ حق ہے اس لئے تم صرف

رعایت مت کرو

اللہ کو حاضر و ناظر جان کر سچ بات کہہ دو (وَ اللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا) ایسا نہ ہو کہ تمہارے جذبات یعنی کسی رشتہ دار کی رعایت کا خیال یا کسی بڑے آدمی کا ڈر، تمہیں سچ کہنے سے روک دیں (فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى اَنْ تَعْدِلُوْا) اگر تم نے گواہی دیتے وقت کوئی پیچ دار بات کی (جو صاف صاف نہ ہو اور جس کے دو معنی نکلتے ہوں) یا کسی سوال کے جواب دینے سے پہلو تہی کر گئے تو تم انسانوں سے تو اسے چھپا سکتے ہو لیکن خدا کو سب

گریز کبھی نہ کرو

کچھ معلوم ہوتا ہے (وَاِنْ تَلْوٗا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۱۳۵)

تم نے دیکھا کہ سچی سچی گواہی دینے کے متعلق کس قدر تاکید کی گئی ہے. گواہی سے یہ مطلب نہیں کہ جب تمہیں عدالت میں بلایا جائے تب گواہی دو. اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی معاملہ سامنے آئے تو اس کی بابت جو کچھ تمہیں معلوم ہے اسے سچ سچ بیان کر دو اور کسی سے مت ڈرو.

جھوٹی گواہی

جھوٹی گواہی کبھی نہ دو. مومنین کی صفت یہ ہے کہ

اَلَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ لا
(۲۵/۷۲)

"یہ لوگ کبھی جھوٹی گواہی نہیں دیتے."

نوٹ:۔

گواہی بھی عدالت تک محدود نہیں.
جس جگہ بھی آپ کسی بات کی بابت کچھ
بتائیں وہ آپ کی گواہی ہو گی۔ اسے
ٹھیک ٹھیک بتانا چاہیئے۔

○ ○ ○

قرآن میں ہے

یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت (دوسروں کی پرورش کے لئے) دے دیں۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹). ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہو۔

رسول اللہؐ نے فرمایا:

لَا يَقْتَسِمُ وَرَثَتِي دِيْنَارًا۔ مَا تَرَكْتُ بَعْدَ نَفَقَةِ
نِسَائِيْ وَ مُؤْنَةِ عَامِلِيْ فَهُوَ صَدَقَةٌ۔

(بخاری، جلد۴، صفحہ ۱۰۱، کتاب الفرائض)

میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہ ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی خوراک کے بعد جو کچھ بھی بچے صدقہ ہوگا۔

involved. It may be repeated here that Surah 4, Verse 34 tackles not any personal relatedness between husband and wife, where husbands arrogate to themselves the prerogative of beating their wives black and blue and throwing them out of their bedrooms. It is this misreading of the verse because of which wife-beating is so rampant in almost all Muslim countries. Even so-called educated husbands claim this "Qoranic" right to beat their wives, and if they do not beat it is to be seen as a favour in a spirit of magnanimity! Talking of "rebellion", the Quran chides men and husbands as well in their role as protectors. They can also be "rebellious" in the sense that they ill-treat and desert their wives. Again it is the administration through its court that arbitrate (as in the woman's case) and bring about an amicable understanding between them and settle the money-matters on conditions that are workable. (4/128)

Such are the details communicated by Allama Parwez on this very sensitive issue. The details are definitely out of the rut of traditional translations and certainly more convincing. In any case, it is worth pondering over and taking up the challenge for further research. It is difficult to give up ideas that have the sanction of history and centuries of time to back it up, even when these ideas are negative and unproductive. Nevertheless the effort must go on, for anything positive said or written is never lost.

ضرورت سٹاف

ادارہ طلوعِ اسلام کو ایک سیکرٹری کی فوری ضرورت ہے
تعلیم بی کام یا اکاؤنٹس اور دفتری امور سے کماحقہ واقفیت
کمپیوٹر استعمال کرنے کی اہلیت اور قرآنی فکر سے دلی لگاؤ۔
مشاہرہ حسبِ قابلیت ۔ اسناد کے ساتھ خود ملیں

چیئرمین
ادارہ طلوعِ اسلام 25 بی گلبرگ 2 لاہور فون 876219

hundred years. In time it has become more and articulate and vocal. Already the copious anti- literature in showing signs of dwindling ...lation in those countries, and the women's ...eration movement could lead those areas into a ...risis. As the third world countries (where the extra ...ns billions have been produced) develop and women gain awareness like their counterparts in the first world, similar literature and movements will blast the status quo. It will then become a world-wide crisis.

Now, the Quran is for all times. It visualises the future possibilities and accordingly lays down the guidelines. Surah 4, Verse 34 becomes applicable only in such a contingency. Otherwise it reamins redundant. So, when the world is faced with such a crisis, women will be counselled against this attitude. Of course, it is but natural that unless they are helped in retaining the confidence and the certainty that marriage and motherhood is not the end of all experience, it will not show results. If this counselling fails and the anti uterus movement shows no sign of abating, then sexual indulgence, by and large becomes irrelevant. Sex is not for pleasure alone. The administration and the court can then decide on (temporary) separation, husbands abstaining from sex and thereby putting psychological pressure on the wives. If even this does not bring any change in attitude, then the court can inflict corporal punishment, not the husband. Indeed the very idea of the husband beating the wife dishonours and demeans the wife and consequently the family life. Above all, it goes against the very values of the Quran (17/70) (Regarding all kinds of punishments, in my article "Quranic Approach towards change" published in Tolue-Islam of January this year, I've taken the position that these are local and historical and the nature of punishments can change from time to time and place to palce. Regional and local historical continuity, provided the punishments are not too barbaric-makes it easirer to implement: secondly the change is inevitable when the cultural level of the human mind reaches heights of refinement and beauty. Some psychologists in the meantime accept corporal punishment as part of treatment.)

The rest of the verse emphasises that if women retract from their stand, there is no vendetta

In a male-dominated society it eventually comes home to a woman that what smothers and denigrates her is her uterus, so why not do away with it? As Carol Driscoll points out: "It should not come as a shock to realise that women can never hope to be liberated in any sense if they are denied the right to control their bodies, especially their reproductive organs."

This anti-uterus attitude may lead a woman to decide not to have a baby. This kind of protest will never come from a man, for he never has to go through this process. He can never even appreciate what it entails both physically and emotionally. It may also be noticed that with more and more awareness and enlightement the woman feels unfulfilled with her tradional role. Is child bearing the ultimate? Vicki Pollard says: "Natural childbirth has been glorified as the most beautiful moment in a woman's life. This is unfortunate because it leads to the idea that motherhood is the ultimate experience in life." But a woman is a human being, and her head and heart are no less clamouring for artistic and intellectual creativity apart from sheer procreation. Such rumblings of dissatisfaction and rebellion are reflected even in ancient Greek literature where wives had no part to play in the cultural pursuits, when that country was passing through its most elevating and productive phase in its history. In Euripide's "Medea", the rebel woman spoke out thus:

"Sooner would I stand,
Three times to face their battles,
Shield in hand,
Than bear one child".

Such individuals have existed perhaps in every phase of history and every society. A few individuals do not matter, but if this feeling becomes collectively articulated and gains momentum as a movement then the survival of the human specie is threatened. At this stage of the dialogue my immediate retort was: On the contrary the world is threatened with the burden of overpopulation: we are two billion too many; in this context it is ridiculous to imagine that the human specie is threatened with extinction, or ever will be in the procreative sense. To this Parwez sahib refered to the liberation struggle waged by the women of Europe and North America in the past two to

superiority complex. In fact both excel each other in their unique gender potentials bestowed on them by the Creator. The uniqueness of the woman lies in her capacity to carry the baby in her womb, lactate and nurture it. This incapacitates her for a while for which the men are enjoined to perform the function of relieving her of the anxiety of this situation by giving her security and protection. This in no way implies that a woman is debarred from earning (4/32) or that the man can strangulate her economically. (In any case, the ultimate objective of the Quranic socio-economic order and system is to guarantee basic needs to all men and women not as a favour but as a matter of right.) Also, the Quran is envisaging a people who have already gone through a metamorphosis, a change from infantile equation of dominance and subservience to human partnership. After having said this, the Quran goes further to advise women to safeguard their biological function in the interest of the perpetuation of the human specie in accordance with the laws of nature. The next sentence in the verse refers to a possible "rebellion" ('nashuza hunna'), translated as such by Marmaduke Pickthall, on the part of women. Parwez Sahib also uses the word "Sarkashi" in his Mafhum-ul-Quran. The question arises as to rebellion against what and against whom. The traditional mind seems to immediately turn in the direction of sexual waywardness, followed by three stages of preventing it as laid down in the Quran (1) they should be counselled against it (2) the husbands should separate from their wives (3) corporal punishment can be meted out to them by the husband, if the first and the second stages show no results. Seen with such reference, the woman's mind naturally balks at it. Why was not the sexual waywardness and immorality of the man included in this verse,(It is included in Verse 4 : 128-Editor) I cried out in despair. Here two points must be understood at the very outset, explained Allama Perwez. Firstly, the Quran in this verse discusses the issue not between husband and wife, but between men and women in general. As such the matter is tackled by the society and the administration through its institutions, such as the court. Secondly, the issue at stake is not a woman's sexual waywardness but her "rebellion" against the biological function of procreation.

A Commentary on Steps Prescribed in Verse 4 : 34 For Correcting Family Jars.

By : Professor Miss Shamim Anwar

(This topic is open for discussion. We shall walecome comments from our readers on views expressed herein. Editor)

Surah 4, Verse 34

The decade of the 1980's has witnessed a desire on the part of women to find out for themselves the Quranic injunctions regarding human issues in general and the gender issue in particular. In Pakistan, after a great deal of agitational activity, women seem to have settled down mainly to intellectual activity. This has taken the form of seminars and discussions and the establishment of research centres.

One of the verses that preoccupies the mind most, is Surah 4, Verse 34. In traditional translations its impact, in my view, is primitive and horrofic, and totally unacceptable to the humanity and self-esteem of womanhood and the institution of the family itself. It was in this mood which I shared with many of my compatriots that I approached Mr. G.A. Parwez, the great Iqbalite, for further clarification of the above mentioned Quranic verse. I am glad I did, because he fell fatally ill not very long after this. I would have missed out on the details for what emerged out of our dialogue was for me an original rendering of the verse unknown to me in any other literature, including his own published works. No doubt the meaning and suggestion is implicit in his "Mafhumul-Qoran", which I shall follow phrase by phrase, but the comprehensive details given below are based on our dialogue which I would like to share with my readers. I write on Allama Parwez's authority, and any lapse is entirely my responsibility.

Surah 4, Verse 34 asserts, to begin with, as elsewhere (2/228, 33/35) that men and women are equal in the exercise of their human rights and duties. The difference lies in the biological functions of the two, thereby complementing each other. This "difference" does not mean inequality and the time-honoured male chauvinism which is pathetically a victim of